مطابق جدید نصاب ایم اے

تاریخِ تفسیر

و

اصولِ تفسیر

پروفیسر میاں منظور احمد

ایم اے علوم اسلامیہ (گولڈ میڈلسٹ) ★ ایم اے عربی (گولڈ میڈلسٹ)

علمی کتاب خانہ ○ کبیر سٹریٹ
اردو بازار ○ لاہور

قیمت ۔/۴۵ روپے

مطابق جدید نصاب ایم اے

تاریخِ تفسیر

و

اصولِ تفسیر

○

ایم۔ اے

پروفیسر میاں منظور احمد

ایم اے علوم اسلامیہ (گولڈ میڈلسٹ) ★ ایم اے عربی (گولڈ میڈلسٹ)

فاضل دیوبند۔ فاضل عربی

لیکچرار اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور

ILMI BOOK HOUSE
Urdu Bazar, LAHORE
Phone : 62833

علمی کتاب خانہ ○ کبیر سٹریٹ
اردو بازار ○ لاہور

طباعت بار اول
طباعت بار دوم — جون ۱۹۸۱ء
طابع — منظور پریس اردو بازار لاہور
ناشر — علمی کتاب خانہ
قیمت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

حرفِ اوّل

تفسیر و اصولِ تفسیر کا موضوع بڑا الطویل الذیل ہے۔ یہاں اس پر مفصل و مبسوط بحث مد نظر نہیں چند اہم ابحاث جن کا تعلق ایم اے علوم اسلامیہ کے امتحان سے ہے انہیں جدید ترین نصاب کے مطابق زیر بحث لایا گیا ہے۔ تفصیل و تطویل کو چھوڑ کر اختصار کو پیش نظر رکھا گیا ہے تاکہ ایک تو یہ رسالہ طویل نہ ہو جائے دوسرے طلبہ اور قارئین کے لیے باعث ملال نہ ہو۔ طلباء ایک عرصہ سے اصرار کر رہے تھے کہ سلسلۂ تفسیر کے ساتھ ساتھ دوسرے ضروری اجزائے نصاب پر بھی کچھ نہ کچھ لکھا جانا ضروری ہے۔ یہ سطور ان کی ضرورت کے پیش نظر لکھی جا رہی ہیں اللہ تعالیٰ اس کتابچے کو کما حقہٗ مفید بنائے۔

حسب معمول میں نے مختلف موضوعات و ابحاث پر امتحانی نقطۂ نظر کو بھی ذہن میں رکھا ہے بلکہ اصولِ تفسیر میں تو امتحانی سوالات ہی کو بنیاد بنایا ہے۔ اگر کوئی ضروری بحث اب تک امتحان میں نہ آئی ہو تو اسے بھی اسکی اہمیت کی وجہ سے لے لیا ہے۔

امید ہے طلباء اس رسالے کو مفید مطلب پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اسے شرفِ قبولیت بخشے

احقر میاں منظور احمد

الفہارس

نمبر | عنوان | صفحہ

نمبر	عنوان	صفحہ
۱	تقدمہ	
۲	حرف اول	
۳	فہرست مضامین	
۴	تفسیر و تاویل	
۵	تفسیر و تاویل میں فرق	
۶	تفسیر عہد نبوی میں	
۷	تفسیر عہد صحابہ میں	
۸	تفسیر عہد تابعین و تبع تابعین میں	
۹	تفسیر کا دور تدوین	
۱۰	اس دور کی مشہور تفاسیر	
۱۱	تفسیر سقوط بغداد سے انیسویں صدی عیسوی تک	
۱۲	اس دور کی مشہور تفاسیر	
۱۳	بیسوی صدی عیسوی کا تفسیری سرمایہ	
۱۴	برعظیم پاک و ہند کا تفسیری لٹریچر	
	اصول تفسیر	
۱۵	شاہ ولی اللہ کے سوانح حیات اور کارنامے	
۱۶	مرکزیت قرآن وسنت اور شاہ ولی اللہ	
۱۷	الفوز الکبیر کا تعارف	
۱۸	علم اصول تفسیر کی تعریف	
۱۹	قرآن کریم کے علوم پنجگانہ	
۲۰	علوم پنجگانہ میں قرآن کا اسلوب بیان	

صفحہ	مضمون	نمبر
	نصاریٰ سے مخاصمہ	۲۱
	منافقین سے مخاصمہ	۲۲
	علم تذکیر بآلاء اللہ	۲۳
	تذکیر بایام اللہ	۲۴
	تذکیر بالموت و مابعد الموت	۲۵
	نظم قرآن کے معانی میں خفا کا سبب	۲۶
	معانی الفاظ کے مخفی ہونے کے اسباب	۲۷
	غیر معروف قرآنی الفاظ کی شرح	۲۸
	ناسخ و منسوخ	۲۹
	شاہ ولی اللہ کے نزدیک پانچ منسوخ آیات	۳۰
	وہ غیر منسوخ آیات جنہیں منسوخ کہا گیا ہے	۳۰
	اسباب نزول	۳۱
	مفسر کو کن اسباب نزول کا علم واجب ہے	۳۲
	فن توجیہ	۳۳
	دیگر اسباب خفائے معنی	۳۴
	حذف کی مثالیں	۳۵
	ابدال	۳۶
	امر بعید سے تعلق اور تقدیم و تاخیر کلام	۳۷
	اضافہ	۳۸
	انتشار ضمائر اور اختلاف مطالب	۳۹
	محکم و متشابہ	۴۰
	کنایہ و تعریض	۴۱
	مجاز عقلی	۴۲
	قرآن کے اسلوب بدیع	۴۳

نمبر	مضمون	صفحہ
۴۴	ترتیب و تدوین قرآن	
۴۵	اسلوب بیان	
۴۶	ترکیب آیات قرآن کا اسلوب	
۴۷	قرآن کے متعلق سوالات و جوابات	
۴۸	فن تفسیر اور اس کے متعلقات	
۴۹	مفسرین کی اقسام	
۵۰	کتب تفسیر کے آثار و متعلقات	
۵۱	استنباط احکام و مسائل	
۵۲	نوادر قرآن	
۵۳	وہبی علوم	
۵۴	حروف مقطعات	

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم

تفسیر و تاویل

تفسیر لغوی اعتبار سے تفسیر کا مادہ فسر ہے، جس کا معنی ہے کھول دینا، واضح کرنا اور ظاہر کرنا۔ کسی کتاب کے مطالب کو کھول کر بیان کرنا تفسیر کہلائے گا۔ اصطلاح میں تفسیر سے مراد وہ علم ہے جس میں اللہ کی کتاب برحق قرآن کے الفاظ و معانی، احکام و مطالب، اسباب نزول اور ناسخ و منسوخ وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے۔ اس ضمن میں علم لغت، صرف ونحو، معانی و بیان، حدیث و فقہ اور دیگر نقلی و عقلی علوم سے بھی مدد لی جاتی ہے۔ علم تفسیر کی غرض و غایت یہ ہے کہ کلام اللہ کے معانی معلوم کیے جائیں اس علم کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے صحیح طور پہ کتاب الٰہی سے شرعی احکام معلوم کرنے اور جدید احکام کا استنباط کرنے کا ملکہ پیدا ہوتا ہے۔ اس علم کی فضیلت کا اس سے بڑا نشان اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کا موضوع اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اہمیت اس کی یہ ہے کہ دنیا و آخرت کی سعادت اس سے حاصل ہوتی ہے۔ اپنے موضوع اور مقصد کے اعتبار سے یہ علم اشرف و اعلیٰ ترین ہے۔ تفسیر کا شغف رکھنے والوں کے لیے اس سے بڑھ کر فخر اور کیا ہو سکتا ہے کہ سب سے پہلا مفسر خود اللہ تعالیٰ ہے۔ علم تفسیر کا مشہور قاعدہ ہے القرآن یفسر بعضہ بعضاً (قرآن کے بعض حصے دوسروں کی تفسیر کرتے ہیں)، اور آیت قرآنی لتبین للناس ما نزل الیھم کے تحت اللہ تعالیٰ کے بعد تفسیر کلام اللہ میں دوسرا نمبر سید الوجود حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ بلکہ اگر زیادہ گہری نظر سے دیکھا جائے تو دوسرے تمام علوم و فنون اس غرض کے لیے ہیں کہ ان کی مدد اور تعاون سے اللہ تعالیٰ کے کلام کا معنی و مطلب سمجھا جائے۔ اس غرض رفیع کے لیے جو علم وضع ہوا ہے اسے علم تفسیر کہتے ہیں۔

تاویل یہ لفظ اول سے نکلا ہے، جس کا لغوی معنی ہے پھیرنا، لوٹنا، لوٹانا، تعبیر بتانا۔ چنانچہ سورۂ یوسف میں تاویل الاحادیث (خوابوں کی تعبیر) اور تاویل رؤیا کے الفاظ اسی لغوی معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ اصطلاح اہل تفسیر میں پہلے پہل تاویل کا لفظ تفسیر کا مترادف تھا، بعد میں کچھ فرق کر لیا گیا اور تاویل کی دو قسمیں قرار پائیں۔ ایک تاویلِ حق اور دوسری تاویلِ باطل (جو مبنی بر نفسانیت خود ساختہ تفسیر کے لیے استعمال

"تاویل کا ایک معنی انجام، حقیقت اور کسی پیشگوئی کا ظہور بھی ہے، چنانچہ آیت قرآنی ولما یاتھم تاویلہ میں یہ لفظ بمعنی انجام اور لا یعلم تاویلہ الا اللہ میں حقیقت کے معنی میں آیا ہے (بشرطیکہ اللہ پر وقف کیا جائے!) اور ھذا تاویل رؤیای میں تعبیر کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

علمائے تفسیر کی اصطلاح میں تاویل سے مراد یہ ہے کہ اگر کسی لفظ یا آیت کے معانی میں کئی احتمال ہوں تو غور و فکر کر کے حقیقت رسی کی کوشش کرنا اور کوئی ایک مناسب تر معنی متعین کرنا تاویل کہلاتا ہے۔

تفسیر و تاویل میں فرق

جیسا کہ اوپر گزرا، متقدمین کے ہاں تفسیر و تاویل کے الفاظ مترادف تھے اور وہ ان الفاظ کو ایک دوسرے کی جگہ پر بے کھٹکے بولتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ زمانہ نبوت سے ابھی زیادہ دوری نہ ہوئی تھی اور قرآن کے غلط معانی اور فاسد تاویلات کا دروازہ ابھی کشادہ نہ ہوا تھا۔

چنانچہ بعض فاضل و جلیل القدر اہل تفسیر کی یہی رائے ہے کہ یہ دونوں الفاظ ہم معنی ہیں۔ لیکن متاخرین کے ہاں چونکہ بے شمار اقوال و تعبیرات میں سے کسی ایک یا دو کو منتخب کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی، ملحدین اور زنادقہ نے قرآن کے جو غلط معانی بیان کیے تھے ان کا رد بھی انہیں کرنا پڑتا تھا، لہٰذا اصطلاحی طور پر تفسیر و تاویل کو الگ الگ کر دیا گیا۔ چنانچہ علامہ ابو حیان ؒ الاندلسی کے نزدیک علم تفسیر کی تعریف یہ ہے کہ، وہ ایک ایسا علم ہے جو قرآنی الفاظ کو بولنے، ان کے مدلولات اور احکام (افرادی ہوں یا ترکیبی) اور ترکیب کے بعد جملہ بن جانے کی صورت میں ان کے معانی اور ان کے تتموں سے بحث کرتا ہے۔

امام راغب ؒ اصفہانی کے نزدیک مفردات القرآن کی شرح تو تفسیر ہے اور جملوں اور کلام کی شرح تاویل۔ یہی فرق علامہ اصبہانی ؒ نے بیان فرمایا ہے۔ لیکن امام قشیری ؒ نے ایک دوسرا ہی فرق ظاہر کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ تفسیر سماع و اتباع پر موقوف ہے جبکہ تاویل اجتہاد و استنباط کا نام ہے۔ گویا کتاب و سنت کی روشنی میں قرآن کا متعین ہونے والا مفہوم تو تفسیر ہے اور علمائے راسخین کو اللہ تعالیٰ جو علوم و معارف سمجھا دیں وہ تاویل کی ذیل میں آتے ہیں۔ علامہ ثعلبی ؒ کا کہنا ہے کہ تفسیر سے مراد ہے کسی لفظ کے موضوع معانی کا بیان اور تاویل کا مطلب ہے باطنی معانی کو کھولنا۔ گویا تفسیر دلیل مراد ہے جبکہ تاویل حقیقت مراد۔ علامہ کے اس بیان سے تاویل کا تفسیر سے ایک درجہ آگے ہونا اور اس سے اعلیٰ و اشرف ہونا معلوم ہوتا ہے۔ بعض علماء نے تفسیر کو روایت سے اور تاویل کو درایت سے خاص مانا ہے۔

کچھ حضرات نے امام قشیریؒ کے اتباع میں قرآن کے سادہ اور صاف معانی جو بہ دے سنت ثابت ہوں، ان کے بیان کو تفسیر اور علمائے مجتہدین کے استنباط واجتہاد کو، جن کے ذریعہ سے وہ احکامِ الٰہی کو نکالتے ہیں، "تاویل" قرار دیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ ظاہر کے مطابق اور قطعی معنی تو تفسیر ہے خواہ وہ پیغمبرؐ سے ثابت ہو یا کسی اور بزرگ سے، مگر جو معنی بظاہر خلافِ ظاہر ہو مگر قواعد و قرائن اور سیاق و سباق کے مطابق ہو وہ تاویل ہے۔

اس بحث سے تفسیر و تاویل کا فرق بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ لیکن عام استعمال میں یہ دونوں لفظ اب بھی ہم معنی ہی سمجھے جاتے ہیں، صرف علماءِ فن کی اصطلاح میں ان کے درمیان فرق کیا گیا ہے۔ اب عام طور پر تفسیر کا لفظ بولتے ہیں جو اصطلاحی تفسیر و تاویل دونوں کو محیط ہوتا ہے، علیٰ ہذا القیاس بعض دفعہ لفظِ تاویل کا بھی استعمال عام معنی میں کیا جاتا ہے ویسے پہلا لفظ کثیر الاستعمال ہے اور دوسرا قلیل الاستعمال۔

تفسیر عہدِ نبویؐ میں

جنابِ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اللہ تعالیٰ نے جو مختلف حیثیتیں بیان فرمائی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ آپؐ کتابِ الٰہی کے مبیّن (واضح کرنے والے، کھول کر بتانے والے) تھے۔ لفظِ مفسّر کا یہی مفہوم ہے۔ گویا آپ قرآن پاک کے مفسّر تھے: لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ (النحل ۴۴)۔ دوسری آیات میں آپ کو معلّمِ کتاب و حکمت اور مزکّی بھی فرمایا گیا ہے: يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ (البقرہ ۱۲۹)۔ ایک جگہ فرمایا گیا ہے: لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ (النساء ۱۰۵)۔ پس ان آیات کی روشنی میں آپؐ کی حیثیت یوں واضح ہوتی ہے کہ آپؐ کتاب اللہ کی تعلیم دیتے تھے اور لوگوں کو اس کی گہرائی میں اتارتے تھے، اپنے نورِ باطن اور تربیتِ صالحہ سے ان کے اخلاق کو درست کرتے تھے، اللہ کی دکھائی ہوئی راہ کے مطابق فیصلے کرتے تھے اور اللہ کی کتاب کے مطالب کو کھول کھول کر بیان کرتے تھے۔ قرآن مجید تدریجاً اترتا رہا، لوگ آپ کی تعلیم و تلقین سے اسے یاد کرتے گئے اور اس کی گہرائی میں اتر کر اس پر عمل پیرا ہوتے گئے۔ چنانچہ عبد اللہ بن عمرؓ وغیرہ سے منقول ہے کہ انہوں نے قرآن کے علم کے ساتھ ساتھ اس پر عمل بھی حضورؐ سے سیکھا تھا۔

آپؐ کی مجلس ہر وقت درس و تدریس اور تعلیم و ارشاد کی مجلس ہوتی تھی۔ لوگوں سے

فرمادیا گیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ وقت نکال کر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوں اور دین میں تفقہ حاصل کر کے واپس لوٹیں : لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم ۔ انہیں قرآن کے تعلیم و تعلم کی ترغیب دی جاتی تھی ۔ خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ (الحدیث) قرآن کے تدبر و تفکر پر زور دیا جاتا ہے : اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ — لِیَدَّبَّرُوْٓا اٰیٰتِہٖ — لَعَلَّھُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ ۔ قرآن کے علم کو معیارِ فضیلت بنا دیا گیا تھا ، حتیٰ کہ انتظامی عہدے ، سپہ سالاری ، قبائل کی سرداری وغیرہ کو بھی اس سے منسلک کر دیا گیا تھا ۔ آپؐ کی محفل میں قرآن جاننے والوں کو اچھی نظر سے دیکھا جاتا اور نماز کی صفوں میں انہیں آگے جگہ ملتی تھی ۔ جنگِ اُحد کے شہداء کو ایک ایک قبر میں متعدد لوگوں کے حساب سے دفن کیا گیا تھا ۔ جنازے اور قبر میں رکھنے کے متعلق حضورؐ نے ارشاد فرمایا تھا کہ زیادہ قرآن جاننے والوں کو مجھ سے قریب رکھو اور دفن میں بھی مقدم کرو ۔

حضورؐ خود مجسم قرآن تھے : یٰسٓ وَالْقُرْاٰنِ الْحَکِیْمِ اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ٥ ام المؤمنین عائشہ صدیقہؓ کا ارشاد حدیث میں ہے کہ : کَانَ خُلُقُہُ الْقُرْاٰن ۔ آپ کا قول و فعل اور تقریر (تائید و توثیق) قرآن کی شرح و تفسیر کی حیثیت رکھتا تھا ۔ ویسے تو اس لحاظ سے ہر حدیث تفسیرِ قرآن ہے لیکن خاص طور پر بعض آیات کی تفسیر بھی آپؐ سے منقول ہے جسے ائمہ حدیث نے اپنی کتابوں میں کتاب التفسیر کے عنوان سے روایت کیا ہے ۔ حضورؐ اکثر اپنے وعظ و ارشاد میں قرآن کی آیات سے استدلال و استشہاد فرمایا کرتے تھے بعض صحابہؓ مثلاً عبداللہ بن عباسؓ کے حق میں آپؐ نے علمِ قرآن (تفسیر) کی دعا فرمائی تھی : اللھم علمہ الکتٰب ۔ آپؐ سے سیکھ کر دوسروں کو پہنچا دینے کا بھی حکم دیا تھا ، چنانچہ ارشاد ہے بلغوا عنی ولو اٰیۃ ۔

غرض حضورؐ کے اقوال و افعال اور تقریرات سب تفسیرِ قرآن کی حیثیت رکھتے ہیں اور آپؐ امت میں پہلے مفسر تھے ۔ علمِ تفسیر کی بنیاد بھی آپؐ ہی نے رکھی ۔ صحابہؓ کو بوجہ عرب ہونے کے قرآن کی فہم و تفہیم میں جو آسانی میسر تھی وہ آپؐ کی موجودگی میں پورے برگ و بار لائی اور آپؐ نے اپنی تربیت سے ان حضرات کو مفسرِ قرآن بنا دیا تھا ۔ ام المؤمنین عائشہؓ ، جناب ابوبکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ و علیؓ سے آیاتِ قرآنی کی نبویؐ تفاسیر کتبِ حدیث و سیرت میں منقول ہیں ۔ آپؐ کا تربیت یافتہ اور پروردہ ہونے کی حیثیت سے جناب علیؓ کو اس خصوصی میں ایک امتیاز حاصل تھا اور صحابہؓ کثرت ان کی رائے لیا کرتے

تھے۔ عبداللہ بن عباسؓ سے تو ایک مستقل تفسیر ان کے شاگردوں کی معرفت منقول ہوئی ہے۔ علم فرائض میں کاتبِ وحی زیدؓ بن ثابت کا اور فقہ و احکام میں معاذؓ بن جبل کا مقام بہت بلند تھا۔ عبداللہ بن مسعودؓ کے علم و فضل کی مدح تو خود زبانِ نبوّت سے نکلی۔ اُبی بن کعبؓ کو قراءت و تجوید کے فن میں خاص ملکہ حاصل تھا اور اس کا اظہار حضورؐ نے خصوصاً فرمایا تھا۔

یہ سب ہدایت کے چراغ اس شمع سے روشن ہوئے تھے جن کا نامِ نامی محمدؐ ہے، صلی اللہ علیہ وآلہٖ وصحبہٖ وسلم ؎

یک چراغیست دریں بزم کہ از پرتوِ آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

نبیِ امی و کرسی نشین درس دہے ؎
ز جبریل سبق بردہ ای تدلّی را

حضورؐ نے قرآن پاک کی کتابت تو بڑے اہتمام اور حزم و احتیاط سے خود اپنی زیرِ نگرانی کرائی، لیکن ابتداء میں اس خدشہ کے پیشِ نظر کہ قرآن اور غیر قرآن میں التباس نہ ہو جائے، لوگوں کو اپنے اقوال و ارشادات کے زبانی یاد رکھنے، دلوں میں نقش کرنے اور اذہان میں بٹھانے کا حکم دیا اور کتابت سے منع فرما دیا۔ آگے چل کر جب کہ لوگ قرآن اور غیر قرآن کی پہچان کے ماہر ہو گئے، قرآن کا کافی حصّہ لکھا جا چکا اور لکھنے پڑھنے کا رواج بھی عام ہو گیا تو آپؐ نے یہ پابندی اٹھا دی تھی۔ آپؐ کی اجازت، علم و اطلاع بلکہ بعض دفعہ حکم سے بعض مجموعہ ہائے احادیث لکھے گئے۔ وجہ یہ تھی کہ اب لوگوں کو معلوم ہو گیا تھا کہ قرآن یہ ہے اور اس کی شرح و تفسیر یہ۔ خدا کی کتاب یہ ہے اور اس کی شرح میں حضورؐ کا کلام یہ۔ آپ نے حکم دیا تھا کہ: قیدوا العلم بالکتابۃ ایک صحابی نے حافظے کی خرابی کی شکایت کی تو فرمایا: إستعن بیمینک (اپنے دائیں ہاتھ سے مدد لو، یعنی لکھ لیا کرو)

اصولِ تفسیر میں یہ بات مسلّم ہے کہ سب سے پہلے قرآن کی تفسیر خود قرآن سے ہی کی جائے، کیونکہ قرآن مجید مضامین کو سمجھانے کے لیے یا ان کی اہمیت کے پیشِ نظر ان کا بار بار اعادہ کرتا ہے۔ ایک ہی مضمون کو متعدد جگہ بیان کرتا ہے، کہیں اجمال و اختصار سے اور کہیں اطناب و تفصیل سے۔ پس اس کے اجمال کو اسی کی بیان کردہ تفصیل و توضیح کی طرف راجع کیا جائے گا تاکہ مطالب واضح ہو سکیں۔ دوسرا مسلّم اصول یہ ہے کہ قرآن کی

تفسیر صاحب قرآن کی سنت و حدیث سے کی جائے، کیونکہ سنت کی حیثیت قرآن کے عملی نمونے اور توضیح و تشریح کی ہے۔ آپؐ نے جو کچھ فرمایا یا کیا ہے وہ قرآن ہی کی تفسیر کے ذیل میں شمار ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا صحیح تر ہوگا کہ حضورؐ ہر وقت اور ہر جگہ قرآن کی تفسیر و تشریح میں مصروف رہے اور زندگی بھر یہی کام سرانجام دیا۔ نزولِ قرآن کا مقصد ہی یہ تھا کہ انسانوں کی ہر معاملے میں رہنمائی کی جائے۔ یہ رہنمائی اپنی عملی صورت میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث و سنت کے سانچے میں ڈھل کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ قرآن اور صاحب قرآن اس حیثیت سے باہم متحد ہیں کہ پہلا اجمال ہے اور دوسرا اس کی تفسیر پہلا اسرار علم ہے اور دوسرا علم و عمل کا مجموعہ، پہلا اصول پیش کرتا ہے اور دوسرا ان کے مطابق زندگی کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ہمارے سامنے رکھ دیتا ہے۔

تفسیر عہد صحابہؓ میں

صحابہؓ وہ پاکباز نفوس ہیں جنہیں اسلام کو براہ راست صاحب رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے دہن مبارک سے سیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ حضورؐ کی تعلیم و تربیت اور تزکیہ کے وہ پہلے مخاطب ہیں، "خیر امت" کا اولین طبقہ، "امت وسط" کا پہلا مصداق اور قرآن کی تبلیغ و تعلیم میں حضورؐ کے اور ساری امت کے درمیان وہ پہلا واسطہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ان پر گواہ اور انہیں ساری کائنات انسانی پر گواہ بنایا ہے: لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا (البقرہ) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ کے آخر میں انہی حضرات سے دریافت فرمایا تھا کہ: الا ھل بلغتُ؟ "بتاؤ کیا میں نے خدا کا پیغام پہنچا دیا ہے؟" تو ان کے اثبات میں جواب دینے پر تین مرتبہ اللہ تعالیٰ کو گواہ قرار دیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ یہی حضرات دین کی تبلیغ و تعلیم میں حضورؐ کے نمائندے اور آپؐ میں اور دوسرے سب انسانوں میں رابطہ ہونے کی حیثیت رکھتے تھے۔

ان حضرات نے بڑی محنت اور جانکاہی سے قرآن پڑھا تھا اور حضورؐ سے اس کے معانی و مطالب سیکھے تھے۔ یہ اسباب نزول کے ماہر، ناسخ و منسوخ کے عالم اور منشائے الٰہی کے رمز شناس تھے۔ خود عرب ہونے کی حیثیت سے انہیں قرآن کے سادہ معانی و مطالب کو جاننے میں کوئی دقت پیش نہ آسکتی تھی، لیکن قرآن کی ایک خاص اصطلاحی زبان بھی ہے جس میں مثلاً صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم، حج، جہاد، اخلاق، برّ و تقویٰ، اثم و عدوان، معروف و منکر، نکاح و طلاق وغیرہ الفاظ کے خاص اسلامی اصطلاحی معانی بھی تھے۔ ان معانی کی

تفہیم ان حضرات کو بالمشافہ حضورؐ سے حاصل ہوئی تھی اور انہوں نے آگے امت کو منتقل کی تھی۔ انہوں نے نہ فقط علم بلکہ اس کے ساتھ عمل بھی حضورؐ کی صحبتِ پاک میں حاصل کیا تھا۔

دورِ خلافتِ راشدہ میں بڑے بڑے اہم مسائل فوراً پیش آ گئے، مثلاً قتالِ مرتدین، منکرین و مانعینِ زکوۃ کا مسئلہ، جدید جعلی مدعیانِ نبوت کا مسئلہ، جمع قرآن کا مسئلہ، وراثت کی تقسیم کے بعض دقیق مسائل، ممالکِ مفتوحہ کے اہم مالی و انتظامی مسائل مثلاً جزیہ، خراج، عشور وغیرہ، فوجوں کی تنظیم نو کا مسئلہ، بیت المال کی تشکیل کا معاملہ، باغیوں اور خوارج سے قتال و صلح وغیرہ کے مسائل۔ ان مسائل میں یہ حضرات باہم مشاورت کرتے، آزادانہ رائے دیتے، بحث و تمحیص کے بعد معاملات طے ہوتے اور ان پر عمل درآمد کیا جاتا۔ اس کے ساتھ ان حضرات نے تعلیم و تربیت اور تبلیغ و تلقین کے فرائض کی طرف بھی پوری توجہ کی۔ میدانِ جنگ ہو یا امن کی حالت، سفر ہو یا حضر، ہر حالت میں تعلیم و تلقین کا سلسلہ جاری رہتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک گشتی مراسلہ ساری سلطنت میں بھجوایا تھا کہ جن لوگوں کو امراء یا عمال سے کوئی شکایت ہو وہ براہِ راست دربارِ خلافت میں اسے بے کھٹکے پہنچائیں۔ اور کہ امراء اور عمال کو حاکم بنا کر نہیں بلکہ معلم بنا کر بھیجا جاتا ہے تاکہ وہ لوگوں کو دین سکھائیں۔ حضرت عمر فاروقؓ نے مرکزی مقامات پر بعض جلیل القدر صحابہؓ کو تعلیم دین کی خاطر مقرر فرمایا تھا، مثلاً عبداللہ بن مسعودؓ کو کوفہ میں بھیجا گیا اور وہاں کے گورنر کو ہدایت کی گئی کہ اپنے ضروری مشوروں میں عبداللہؓ کو شامل رکھا کریں۔ ساری سلطنت میں تعلیم قرآن کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ فوجی چھاؤنیوں میں اور جب فوجیں تربیت یا جہاد و قتال کے سلسلے میں باہر مصروف ہوں، تعلیم قرآن سے غفلت یا تساہل قطعاً روا نہ رکھا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اہلِ عجم کو تو قرآن پاک کے الفاظ کی تلاوت کی بھی ضرورت تھی مگر عربوں کو اہلِ زبان ہونے کی وجہ سے محض تلاوتِ الفاظ کی تعلیم ہی نہ ہوتی تھی بلکہ قراءت کا لب و لہجہ، معانی مفردات، مطالب مرکبات، ناسخ و منسوخ اور احکام شریعت بھی سکھائے جاتے تھے۔ یہی چیزیں تفسیر قرآن کہلاتی ہیں۔

اس دور میں ابھی تفسیر یا حدیث کے الگ الگ فنون مرتب نہ ہوئے تھے، ہوتا یوں تھا کہ آیاتِ قرآنی کی تفسیر و تشریح میں جس قدر حدیث و سنت کا مواد لوگوں کو معلوم ہوتا اسے بوقتِ ضرورت بیان کر دیتے اور یادداشتوں میں بھی قلمبند کر لیتے تھے۔ اسی رواج کی بنا پر متقدمین کی کتبِ تفسیر میں ہر آیت کے تحت روایاتِ حدیث کو جمع کر دیا جاتا ہے (مثلاً تفسیر ابن جریر)، اس طریقے کے حسن و قبح پر ہم آگے چل کر گفتگو کریں گے۔ اوپر گزر چکا ہے کہ حدیث و سنت کی حیثیت دراصل کتاب اللہ کی شرح و تفسیر کی ہے۔ اس لحاظ

سے عہد صحابہؓ میں جس قدر تحریری مواد جمع ہوا، چاہے اسے اصولاً حدیثی مواد ہی کہا جائے لیکن تفسیر قرآن کے ضمن میں بھی اسے ضرور شمار کیا جا سکتا ہے۔ پہلی صدی ہجری کے تمام تحریری مواد کو ہم اس ذیل میں شمار کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس دور میں بعض صحابہ رضہ کی یادداشتیں ہمیں ملتی ہیں مثلاً حضرت اُبیؓ بن کعب، جو حضورؐ کے ارشاد کے بموجب صحابہؓ کی جماعت میں اقرأ (سید القراء) ہیں، ان کی ایک تفسیری یادداشت کا کتب حدیث و تفسیر میں سراغ ملتا ہے۔ ابن جریر طبریؒ، ابن ابی حاتمؒ، احمد بن حنبل اور محدث حاکم نیشاپوری نے اس کے حوالے دیے ہیں۔

دورِ صحابہؓ میں جو حضرات خاص طور پر تفسیر قرآن میں معروف تھے ان میں عثمانؓ ذی النورین علیؓ المرتضیٰ، عبداللہؓ بن عباس، زیدؓ بن ثابت، ابو موسیٰ اشعریؓ، جابرؓ بن عبداللہ، عبداللہ بن زبیر، عبداللہؓ بن عمر، عبداللہؓ بن عمرو بن العاص، عبداللہ بن مسعودؓ، اور ابی بن کعبؓ کا نام زیادہ مشہور رہا ہے۔ ان سب میں سے جو مقام تفسیر قرآن میں عبداللہؓ بن عباس اور عبداللہؓ بن مسعود کا تھا وہ کسی اور کو نہ مل سکا۔ اوپر گزر چکا ہے کہ ابن عباسؓ کے لیے حضورؐ نے علم الکتاب کی دعا کی تھی اور لوگوں کو ابن مسعودؓ کے آداب و فضائل اور اخلاق و سیرت کے اپنانے کا حکم دیا تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے جب انہیں کوفہ میں معلم بنا کر بھیجا تھا تو کوفہ والوں کو لکھا تھا:

"عبداللہ بن مسعودؓ کی مجھے خود مدینہ میں ضرورت تھی، میں اس کے علم و فضل سے بے نیاز نہیں ہو سکتا تھا لیکن اپنے اوپر تمہیں ترجیح دیتے ہوئے انہیں کوفہ روانہ کر رہا ہوں۔ ان کی صحبت و تربیت کو غنیمت جانو اور ان سے بھرپور فائدہ حاصل کرو۔"

عبداللہ بن مسعودؓ کی دینی فقاہت مسلم ہے، جب کسی مسئلہ میں ان کا نام آجائے تو علماء کی گردنیں خم ہو جاتی ہیں۔ ان کی صحبت و تربیت نے بڑے بڑے فقہاء اور امام پیدا کیے۔ علی المرتضیٰؓ کا علمی پایہ کون نہیں جانتا، افسوس انہیں اپنے زمانہ خلافت میں اختلافات کے جھمیلوں سے فرصت نہ ملی۔ تاہم کوفہ کے مرکز علم میں ان کے شاگردوں نے عبداللہ بن مسعودؓ کے شاگردوں سے مل کر علم و فضل کا جو چرچا کیا اس سے دنیا واقف ہے۔

تفسیر ابن عباسؓ کسی مستقل کتاب کا نام نہیں۔ عبداللہ بن عباسؓ کے شاگردوں نے جو کچھ اپنے جلیل القدر استاد سے سنا اسے دوسروں کو منتقل کر دیا، انہی روایات کا نام تفسیر ابن عباسؓ ہے۔ ان میں صحیح، ضعیف و سقیم بلکہ ان سے بھی کم تر ہر قسم کی روایات موجود ہیں۔ ان کے مشہور شاگرد مجاہدؒ، عکرمہؒ، سعید بن جبیرؒ، عطاء بن ابی رباح اور طاؤسؒ

بن کیسان ہیں۔ قوی ترین سند روایت وہ ہے جس میں علیؒ بن ابی طلحہ اپنے استادوں (مجاہد یا سعیدؒ) سے اور وہ ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں۔ بقول شاہ ولی اللہؒ تفسیر ابن عباسؓ کا ضعیف ترین سلسلہ یہ ہے جس میں کلبیؒ ابو صالحؒ سے اور ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں۔

حضرات صحابہؓ کی علمی مجالس میں بہت سے تفسیری نکات و مسائل حل ہوتے تھے حضرت عمرؓ نے خاص صحابہ کی ایک علمی مجلس ترتیب دی تھی جس کا ذکر بخاری وغیرہ میں موجود ہے۔ اس مجلس میں وہ کوئی اہم مسئلہ، قرآن کی کوئی آیت یا تفسیر کا کوئی اہم سوال پیش کرتے اور سب لوگوں کو رائے کے اظہار کا موقع دیتے تھے۔ کبھی کبھی اپنی رائے کا اظہار بھی فرماتے اور اکثر دوسروں کی رائے کی تصویب یا تضعیف پر ہی اکتفا ہوتا تھا۔ ان مجالس میں معرکۃ الآراء مسائل حل ہوتے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ سے بعض آیات کی تفسیر منقول ہے جو انہوں نے بر سرِ عام منبر پہ بیان فرمائی تھی۔ مثلاً عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ الآیۃ کی تفسیر میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے متعلق انہوں نے حضورؐ کی وہ مشہور حدیث نقل فرمائی کہ نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو ورنہ عذاب عام کا خدشہ ہے (او کما قال) اور بتایا کہ آیت کا مطلب یہ نہیں کہ لوگوں کو ان کے حال پہ چھوڑ دیا جائے، بلکہ یہ ہے کہ جب تمہاری کوشش کے باوجود کوئی شخص گمراہی سے باز نہیں آتا تو اس کی ضلالت کا بار تم پہ نہیں خود اس صاحب ضلالت پر ہے۔

ام المومنین عائشہ صدیقہؓ سے إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِن شَعَائِرِ اللَّهِ الآیۃ کی تفسیر صحیح احادیث میں منقول ہے۔ آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ صفا و مروہ کی سعی محض مستحب یا مباح کے درجہ میں ہے فلا جناح علیہ ان یطوف بھما ام المومنینؓ نے فرمایا کہ زمانہ جاہلیت میں ذوقِ بت پرستی کے باعث لوگوں نے ان پہاڑوں پہ بت گاڑ دیئے تھے۔ اسلام آیا تو لوگوں کی طبیعت میں صفا و مروہ کی سعی سے انقباض پیدا ہوا۔ انہوں نے اصل سعی کو بھی رسوم شرک میں شمار کیا، لہٰذا قرآن نے لَا جُنَاحَ فرما کر ان کے اس خیال کا رد کیا۔ ورنہ اصل سعی تو مناسکِ حج میں شامل ہے اور ملتِ ابراہیمی کے شعائر میں سے ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اور کئی آیات کی تفسیر بھی ام المومنین سے روایت ہوئی ہے۔

ناسخ و منسوخ کی بحث کتبِ حدیث و تفسیر میں صحابہؓ کی بہت سی روایات بیان

ہوئی ہیں۔ اسی طرح محکم و متشابہ، بر و اثم، تقویٰ اور عدوان کی تفاسیر بھی ان حضرات سے مروی ہیں جو کتابوں میں بکھری پڑی ہیں۔ اس سلسلے میں تفسیر طبری کا مطالعہ بہت مفید ہوگا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ دورِ صحابہؓ میں تفسیر قرآن کے نقطۂ نگاہ سے بہت کام ہوا مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، کوفہ، بصرہ، یمن اور دمشق وغیرہ اسلامی مراکز میں صحابہؓ کے شاگردوں کی جماعتیں تیار ہوگئیں۔ انہی کی روایات کو آگے چل کر کتب و اسفار میں مدون کیا گیا۔ اصولِ تفسیر میں حضورؐ کی حدیث و سنت کے بعد روایاتِ صحابہؓ کا درجہ ہے۔ کوئی شخص تفسیر قرآن میں اس ذخیرے سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ یہی ذخیرہ تمام علوم شرعیہ کی مانند تفسیر کی بنیاد بھی ہے۔ اس ذخیرے میں مرفوع روایات کے علاوہ صحابہ کی اپنی آراء و تفاسیر کا بیان بھی ہے جو تفسیری نقطۂ نظر سے نہایت اہم ہیں۔

تفسیر عہد تابعین و تبع تابعین میں

صحابہؓ کے شاگردوں نے حدیث و سنت کی مانند علم تفسیر بھی صحابہؓ سے حاصل کیا۔ بقول علامہ حافظ ابن تیمیہؒ یہ حضرات تفسیر میں صرف منقول پر ہی اکتفاد نہ کرتے تھے، بلکہ نظر و استدلال اور اجتہاد و استنباط کی راہیں بھی اختیار فرماتے تھے۔ مدینہ منورہ میں مشہور فقہائے سبعہ سنت و فقہ کی مانند علم تفسیر کے بھی امام تھے۔ بصرہ میں حضرت امام حسن بصریؒ اور ابن سیرینؒ تفسیر کے مرکز و منبع خیال کیے جاتے تھے۔ مکہ مکرمہ چونکہ عبداللہ بن عباسؓ کا مسکن تھا لہٰذا یہاں ان کے فیضِ صحبت سے مجاہدؒ، سعیدؒ بن جبیر، عکرمہؒ، عطاءؒ بن ابی رباح اور طاؤسؒ بن کیسان پر مشتمل ایک عظیم جماعت تیار ہوئی۔ علم تفسیر میں ان حضرات کی روایات و اجتہادات نہایت قیمتی اور ثقہ شمار کیے گئے۔ ادھر کوفہ میں عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت علیؓ کے شاگردوں میں علقمہؒ بن قیس، اسودؒ بن یزید اور ابو الاسودؒ دئلی جیسے جبال علم تیار ہوئے۔ ان کے شاگرد امام ابراہیم نخعیؒ اور عامر ابن شراحیل شعبیؒ تھے جو تفسیر و فقہ اور سنت و حدیث میں مرجع انام ہوئے۔ اسی طبقہ میں ابو العالیہؒ، ابو عبدالرحمن سلمیؒ، امام ضحاکؒ اور امام قتادہؒ بھی تھے جن میں سے ہر ایک علم تفسیر و حدیث کا امام تھا۔ خلیفہ عبدالملک بن مروان کی استدعا پر مشہور تابعی سعید بن جبیرؒ

نے غالباً سب سے پہلی باقاعدہ تفسیر مرتب کی حضرت ابوہریرہؓ کے شاگرد ہمام بن منبہ نے ہدایۃ الحق کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں احادیث کے علاوہ کچھ آیات کی تفسیر بھی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ مصر کے کتب خانہ خدیویہ میں ابن عباسؓ کے لائق شاگرد امام مجاہد کی لکھی ہوئی ایک تفسیر موجود ہے۔ محمد بن کعب القرظیؒ نے بھی تفسیر کی کتاب مرتب کی۔ تفسیر کا دورِ تدوین چونکہ تابعین اور ان کے شاگردوں (تبع تابعین) کے بعد باقاعدہ شروع ہوا تھا۔ لہٰذا تبع تابعین کے طبقہ کو بھی ہم تابعین کے دور میں ہی شامل کریں گے۔

تبع تابعین میں مشہور محدث سفیان ثوریؒ، سفیان بن عیینہ، امام شعبہؒ بن الحجاج، مشہور محدث وکیع ابن الجراح، یزیدؒ بن ہارون، عبدالرزاقؒ، آدمؒ بن ابی ایاس، اسحاقؒ بن راہویہ، یحییٰؒ بن سعید، روحؒ بن عبادہ، سدیؒ، عطاء خراسانی، علیؒ بن ابی طلحہ ہاشمی، کلبیؒ، ابن جریجؒ اور مقاتلؒ علم تفسیر قرآن دانی میں مشہور و معروف اور مرجع انام تھے۔ اسی زمانے میں ابوفید مؤرج نے غرائب القرآن، مشہور نحوی امام کسائیؒ نے علم متشابہ القرآن اور امام شافعیؒ نے احکام القرآن پر کتابیں لکھیں۔ تفسیر کا یہ بیش بہا ذخیرہ آگے چل کر فن تفسیر کی باقاعدہ ترتیب و تدوین میں کام آیا۔ اس زمانے میں تدوینِ تفسیر کی ابتدا ہو چکی تھی۔ یہی زمانہ سنت و حدیث اور فقہ کی تدوین و تالیف کا بھی ہے۔

مذکورہ بالا حضرات کے علاوہ دوسری اور تیسری صدی ہجری کے یہ بزرگ بھی علم تفسیر میں مشہور ہوئے، عبداللہؒ بن دینار، عمرو بن دینار، عبدالملکؒ بن عمیر، مکیؒ بن ابراہیم، عبداللہؒ بن المبارک، ابوعاصمؒ النبیل، مکحولؒ، مسروقؒ اور اعمشؒ۔

اس دور میں تفسیری روایات کو احادیث کے مجموعوں میں ملا کر لکھنے اور یاد کرنے کا رواج تھا۔ مشہور محدثین اپنی کتابوں میں اسی رواج کے مطابق کتاب التفسیر کے نام سے الگ ابواب رکھتے ہیں اور ان میں مرفوع و مرسل، منقطع یا مقطوع وغیرہ روایات بیان کرتے ہیں۔ لیکن بعض تصانیف اس زمانے میں خالصتہً تفسیر کے نام سے بھی مرتب ہوئیں جیسا کہ اوپر گزرا۔

تابعین کے دور کے اواخر اور تبع تابعین کے دور میں فرقہ پرستی، اعتزال، الحاد، انکار حدیث اور عقلیت پسندی کے فتنے بھی سر اٹھا چکے تھے، بلکہ ممالکِ اسلامیہ کے بعض اطراف میں تو ان کی حیثیت عظیم سیلاب کی سی ہو رہی تھی۔ اس نئی مصیبت سے نمٹنے کے لیے ابوعمروؒ بن العلاء، امام شعبہؒ، سفیان ثوریؒ، امام مالکؒ بن انس، یونسؒ

بن حبیبؒ، اور وکیع بن الجراح نے علم تفسیر کے بعض ابواب پر کتابیں لکھیں۔ مشہور محدث سفیان بن عیینہؒ نے عقلیت زدہ لوگوں کے نظریات کے رد میں "جوابات القرآن" نامی ایک مستقل کتاب تصنیف کی۔

تفسیر کا دورِ تدوین

تیسری صدی سے سقوط بغداد تک

اوپر کی بحث میں بتایا جا چکا ہے کہ تابعین کے دور میں بعض تفسیری کتب لکھی جا چکی تھیں، اور تبع تابعین نے تدوین تفسیر کا کام بہت آگے بڑھا دیا تھا۔ دیگر علوم شرعیہ کی مانند تفسیر ایک باقاعدہ علم و فن ہونے کی حیثیت سے تیسری صدی ہجری کے اواخر میں کافی حد تک چمک اٹھا تھا۔ اس کے بعد دو صدیوں تک تفسیری کتب کا عظیم سرمایہ مختلف اطراف ممالک اسلامیہ میں وجود میں آیا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کی تفاسیر پر اختصار کے ساتھ معلوماتی بحث کی جائے۔ اس ذخیرے میں بعض کتابیں ایسی بھی ہیں جن کی طباعت کی تا حال نوبت نہیں آسکی، لیکن زیادہ مشہور تفاسیر طبع ہو چکی ہیں۔

تفسیر ابن مخلد قرطبیؒ

بقی بن مخلد قرطبیؒ (ف ۲۷۶ھ) کی تصنیف ہے۔ قرطبیؒ اپنے دور کے بہت بڑے عالم اور مجتہد تھے۔ علامہ ابن حزمؒ اندلسی نے اس تفسیر کی بہت تعریف کی ہے اور اسے بے مثال تفسیر قرار دیا ہے۔ قرطبیؒ چونکہ اپنے خیالات کے اظہار میں شمشیر برہنہ تھے اس لیے مقلدین میں ان کی شدید مخالفت ہوئی۔ ان کی تفسیر حدیث و سنت اور فقہ کے نقطۂ نظر سے نہایت اہم اور قابل قدر ہے۔ یہ تفسیر مشہور تفسیر قرطبی کے علاوہ ہے جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

تفسیر تستری

مشہور بزرگ اور صوفی حضرت ابو محمد سہل بن عبد اللہ تستری کی تصنیف ہے۔ روحانی مسائل اور اشارات صوفیاء پر مشتمل ہے گو قرآن مجید کی تمام سورتوں پر مشتمل ہے لیکن بہت مختصر ہے اور جستہ جستہ آیات پر صوفیانہ نقطۂ نظر سے کلام کیا گیا ہے۔ غالباً مصنف کے پیش نظر لوگوں کے شبہات و اعتراضات کا جواب دینا تھا۔

تفسیر طبری امام ابوجعفر ابن جریرؒ طبری (ف ۳۱۰ھ) کی تالیف ہے جس کی جلالتِ شان، افادے کی اہمیت اور مستند ہونے پر اگلے پچھلے علماء کا اتفاق ہے۔ علامہ مرحوم نے پہلے اسے تین سو جلدوں میں لکھا، لیکن جب شاگردوں نے کہا کہ اتنی ضخیم کتاب کو پڑھے گا کون؟ تو با دلِ نخواستہ اس کا اختصار تیس جلدوں میں کیا۔ تفسیری روایات کو محدثانہ طریقے سے سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور صحیح و ضعیف پر محاکمہ بھی کرتے جاتے ہیں۔ علامہ سیوطیؒ کے بقول نقلِ روایت، توجیہِ اقوال اور ترجیح و استنباط احکام میں یہ تفسیر اپنی مثال آپ ہے۔ امام نوویؒ، علامہ ابو حامد اسفرائنی اور ابن السبکیؒ وغیرہم اس کی تفسیر کی توصیف میں رطب اللسان ہیں۔ کسی روایت کے اس تفسیر میں آجانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ مستند بھی ہے، دیکھنا یہ چاہیئے کہ خود مصنف نے اور دیگر اہلِ تحقیق نے ان روایات کی کیا حیثیت متعین کی ہے۔ امام طبریؒ کے زمانے کا قاعدہ تصنیف یہی تھا کہ ہر قسم کی روایات کو جمع کر دیا جاتا تھا اور خود جامع ان پر کلام کرتا یا اس کام کو دوسروں پر چھوڑ دیتا تھا۔ غرض یہ تھی کہ ایک موضوع پر سارا مواد یکجا ہو جائے۔

تفسیر جبائی امام ابو علیؒ الجبائی معتزلی (ف ۳۰۲ھ) کی تصنیف ہے، انہوں نے اس تفسیر میں بھی تحریکِ اعتزال کو تقویت پہنچانے کی پوری کوشش کی ہے۔

تفسیر اشعری علمِ اہلِ سنت کے علم کلام کے مشہور امام ابوالحسن اشعریؒ (م ۳۲۴ھ) کی تالیف ہے اور اس میں انہوں نے معتزلہ کا بالخصوص اور دیگر فرقِ باطلہ کا بالعموم رد کیا ہے۔ الحاد و تشکیک کے ازالے میں اس کا ایک خاص مقام ہے۔

تفسیر ماتریدی امام ابو منصورؒ ماتریدی (ف ۳۳۳ھ) کی کتاب تاویل القرآن بھی تجدد پسندوں اور فریبِ عقلیت کے مارے ہوؤں کے لیے بڑی قیمتی کتاب ہے۔ اس میں انہوں نے نام نہاد "عقلیت پسندی" کے پردے چاک کیے ہیں اور تفسیر بالرائے کا رد ہے۔

احکام القرآن امام احمد بن علی الرازی ابوبکر جصاص (ف ۳۷۰ھ) کی تصنیف ہے۔ مصنف اپنے زمانے کے حنفی علماء میں امام اور مجتہد مانے جاتے تھے۔ تفسیر فقہی طرز پر ہے جس میں ترتیبِ سور و آیات

کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ علمی و فقہی اختلافات پر مجتہدانہ بحث کی گئی ہے اور حنفی مکتبِ فکر کی نمائندگی کا حق ادا کیا گیا ہے۔ اجتہاد و استنباطِ احکام القرآن کے سلسلے میں بےنظیر تصنیف ہے۔

تفسیر ابن عطیہؒ ابو محمد عبداللہ بن عطیہؒ دمشقی (ف ۳۸۲ھ) کی تصنیف ہے۔ لغت و عربیت کی تحقیق میں ان کا مقام بہت بلند ہے۔ عرب جاہلیت کے نصف لاکھ اشعار انہیں حفظ تھے جن سے تفسیر میں استدلال کیا کرتے تھے۔ کتاب طبع نہیں ہوئی اور اس کے کم از کم تین نسخے استنبول کے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔

تفسیر ابن فورکؒ علامہ ابن فورکؒ مشہور متکلم گزرے ہیں۔ ان کی تفسیر اسی کلامی رنگ کو لیے ہوئے ہے اور علماء میں اس کی بہت وقعت ہے۔

حقائق التفسیر ابو عبدالرحمٰن محمد بن حسن (ف ۴۱۲ھ) مشہور صوفی گزرے ہیں۔ ان کی تفسیر صوفیانہ رنگ میں ایک بلند پایہ تالیف ہے۔

تفسیر ثعلبی امام ابو اسحاق احمد بن محمد بن ابراہیمؒ الثعلبی نیشاپوری (ف ۴۲۷ھ) کی تصنیف ہے۔ کتاب کا نام ہے الکشف والبیان فی تفسیر القرآن۔ ابن خلکانؒ نے اس کی بہت تعریف لکھی ہے۔ لغوی تحقیق، اقوالِ سلف اور اسرائیلیات پر کافی ذخیرہ اس میں موجود ہے۔ کہیں کہیں فقہی مسائل پر بھی کلام کرتے ہیں۔ کتاب کے مختلف اجزاء ہندوستان، مدینہ منورہ اور حلب میں ہیں۔ پوری کتاب غیر مطبوعہ ہے۔

تفسیر ماوردی امام ابوالحسن علی بن حبیب الشافعی الماوردیؒ (ف ۴۵۰ھ) کی تالیف ہے۔ اس کی تلخیص ابوالفیض علی نے کی ہے۔ اس کے بھی مختلف اجزاء (اور مکمل نسخے بھی) آستانہ، رامپور اور حلب میں محفوظ ہیں۔ غیر مطبوعہ ہے۔

تفسیر اصبہانی ابو مسلم محمد بن علی الاصبہانی معتزلی (ف ۴۵۹ھ) کی تالیف ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی تفسیر سے امام رازیؒ نے بہت کچھ نقل کیا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ امام رازیؒ والے اصبہانی یہ نہیں بلکہ ابو مسلم محمد بن بحر الاصفہانی ہیں۔ واللہ اعلم۔

اس دور کے تفسیری مواد پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں نقل کے ساتھ عقل، آثار و اقوال کے ساتھ احکام فقہ اور دوسرے فرقوں کے رد کا شدید رجحان پایا جاتا ہے۔ اس لٹریچر میں جامعیت پائی جاتی ہے اور تفسیر میں ہر علم و فن کو داخل کر لیا گیا ہے۔ مصنفین اپنے اپنے رجحان کے مطابق ایک یا دو تین چیزوں کو منتخب کرتے اور انہی کے نقطۂ نظر سے تفسیر لکھتے ہیں۔ بہت سے فضلا نے حدیث، آثار، فقہ، عقائد و کلام، لغت و نحو اور ردّ فرقِ باطلہ، غرض سب ہی کچھ اپنی تفاسیر میں جمع کر دیا ہے۔ مثلاً امام رازی۔

تفسیر سقوطِ بغداد سے انیسویں صدی عیسوی تک

سقوطِ بغداد سے عالمِ اسلام کو جو شدید دھچکا لگا تھا، لازماً اس کا اثر علوم و فنون اور تصنیف و تالیف پر بھی پڑا۔ مگر علماء نے دنیا کے مختلف گوشوں میں اپنا کام جاری رکھا اور زیرِ تعارف دور میں بہت سی تفاسیر مختلف زبانوں (بالخصوص عربی و فارسی) میں لکھی گئیں۔ چند مشہور تفاسیر کا تعارف یہ ہے:

تفسیر قرطبی

ابو عبداللہ محمد بن ابی بکر انصاری قرطبیؒ (ف ۶۷۱ھ) کی تصنیف ہے۔ علماء میں مصنف اور ان کی تفسیر کی جلالت و عظمت مسلّم ہے۔ اکثر اندلسی حضرات کی مانند وہ بھی فقہ میں مالکی ہیں۔ انہوں نے قصص و تواریخ کو نظر انداز کر دیا ہے اور احکام و استنباطِ دلائل، فقہی اقوال پہ آراء اور ان پر تبصرہ و محاکمہ، وجوہِ ترجیح کا متوازن اور منصفانہ بیان کیا ہے۔ قرآنی آیات کے ساتھ ساتھ سنت و حدیث پر بھی بحث کرتے ہیں۔

تفسیر بیضاوی

قاضی ناصر الدین ابو سعید عبداللہؒ بن عمر البیضاوی شافعی (ف ۶۸۲ھ) کی جلیل القدر تصنیف ہے۔ اصل نام انوار التنزیل و اسرار التاویل ہے۔ مختصر اور خلاصۂ تفاسیر ہے۔ اعراب و معانی، کلام و عقائد، لغت و اشتقاق اور ردّ فرقِ باطلہ بالخصوص معتزلہ میں بے نظیر تصنیف ہے۔ اختصار و جامعیت کی وجہ سے بہت سے ممالک میں داخلِ درسِ دینیات ہے۔ لیکن اس تفسیر میں حدیث کی روایات کو دیکھ کر شبہ ہوتا ہے کہ غالباً قاضی بیضاویؒ اصول و فقہ اور [illegible] میں امام ہونے کے باوجود علم حدیث میں کمزور ہیں۔ حدیث [illegible] کہ ضعیف تو درکنار

موضوع روایات تک اس میں موجود ہیں۔ امام نووی، سیوطی اور حافظ عراقی وغیرہم نے اس کوتاہی پر بیضاوی کا تعاقب کیا ہے اور طویل بحثیں لکھی ہیں۔

تفسیر مدارک حافظ عبد اللہ بن احمد النسفی (ف ۷۰۱ھ) کی تالیف ہے۔ اختصار کے باوجود بہت مفید تفسیر ہے اور عقائد و کلام وغیرہ میں مسلک اہل سنت کی وکالت کرتی ہے۔ علاوہ ازیں وجوہ اعراب، قراآت، علم معانی و بدیع کو بھی پیش نظر رکھتی ہے۔ دو جلدوں میں الگ بھی اور تفسیر خازن کے حاشیہ پر بھی چھپ چکی ہے۔

تبصرۃ الرحمن وتیسیر المنان اعجاز القرآن اور نظم القرآن کے موضوعات کو بالخصوص مدنظر رکھتی ہے، بہت مختصر کتاب ہے مگر اپنے مصنف کی قابلیت وعلم وفضل کی آئینہ دار۔ مصنف کا نام زین الدین علی بن احمد اموی حنبلی (ف ۸۰۱ھ) ہے۔

غرائب القرآن ورغائب الفرقان اس کے مصنف علامہ نظام الدین حسن بن محمد قمی نیشاپوری تھے جو غالباً آٹھویں صدی ہجری کے علماء اہل سنت سے ہیں۔ اس کتاب کو عرف عام میں تفسیر نیشاپوری کہتے ہیں۔ بہت جامع کتاب ہے، تفسیر کی تمام شاخوں کے علاوہ فقہ، حدیث، معانی وبدیع اصول، عقائد وکلام اور رد فرق باطلہ سے مس کیا ہے۔ لیکن لطف یہ ہے کہ اس کے باوجود کتاب آسان اور متوسط درجہ کی ہے۔ پڑھنے والا اکتاتا نہیں، نہ اس کے انغلاق کا رونا روتا ہے۔

لباب التاویل فی معانی التنزیل (خازن) شیخ علاء الدین علی بن محمد ابراہیم البغدادی (ف ۷۴۱ھ) کی تالیف ہے جو عام طور پر تفسیر خازن کے نام سے مشہور ہے۔ بقول مؤلف یہ تفسیر علامہ بغوی کی تفسیر معالم التنزیل کا خلاصہ ہے، نیز انہوں نے کچھ اور فوائد کا بھی اضافہ کیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اسرائیلی روایات اور قصص کا ایک بڑا حصہ اس کتاب میں آگیا ہے۔ ہاں! مؤلف ہر روایت اور قصے کا مقام اور درجہ بیان کر دیتے ہیں تاکہ پڑھنے والا کسی غلط فہمی یا ضلالت میں مبتلا نہ ہو جائے۔

البحر المحیط علامہ ابو حیان اندلسی (ف ۷۴۵ھ) کی مبسوط ومفصل تفسیر ہے انہوں نے خود اس کا خلاصہ النہر من البحر کے نام سے کیا۔ چھپ

ان کے شاگرد تاج الدین احمدؒ (ف ۷۴۹ھ) نے ایک اور خلاصہ کیا جس کا نام الدر اللقیط ہے۔ ابو حیانؒ کی تفاسیر قدیم طرز کی ہیں اور الدر اللقیط میں زمخشریؒ اور ابن عطیہ کی تحقیقات کا رد کیا گیا ہے۔

تفسیر اصبہانی (مشہور) علامہ شمس الدینؒ ابو الثناء محمود بن عبد الرحمن الشافعی (ف ۷۴۹ھ) کی تالیف ہے جس میں امام رازیؒ اور علامہ زمخشری کے نفیس مباحث کو جمع کیا گیا ہے۔ بعض مقامات پر ان کا رد بھی لکھا ہے اور کچھ مفید مباحث کا اضافہ بھی کیا ہے۔

تفاسیر حلبی احمد بن یوسف بن عبد الدائم حلبی نحوی (ف ۷۵۶ھ) نے تین تفسیریں لکھی ہیں، تفسیر ابن السمین الحلبی، الدر المصون فی علم الکتاب المکنون اور عمدۃ الحفاظ فی تفسیر اشرف الالفاظ۔ یہ بزرگ ابو حیانؒ کے شاگرد ہیں اور انہوں نے اپنی کتابوں میں کئی جگہ استاد سے اختلاف کیا ہے۔ علماء کے نزدیک ان کی تفاسیر کو بعض وجوہ سے کشاف پر بھی فوقیت حاصل ہے۔

تفسیر ابن کثیر علامہ حافظ ابو الفداء اسماعیل بن عمرو بن کثیر دمشقی (ف ۷۷۴ھ) کی مشہور و معروف تفسیر ہے۔ اس میں انہوں نے احادیث و آثار کو بیان کر کے تنقید و تبصرہ کیا ہے۔ مفصل تعارف کے لیے ہماری کتاب تفسیر سورۃ المائدہ کا مقدمہ دیکھئے۔

تنویر المقباس فی تفسیر ابن عباسؓ ابو طاہر محمد بن یعقوب فیروز آبادی (ف ۸۱۷ھ) کی مرتب کردہ ہے۔ اس میں انہوں نے حضرت ابن عباسؓ کی تفسیری روایات کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ مصنف نے بصائر اور تفاسیر فاتحۃ الکتاب دو اور تفسیریں بھی لکھی ہیں تنویر المقباس مختصر کتاب ہے لیکن اس میں تفسیری مباحث، فقہی اور کلامی اختلافات کے علاوہ لغت و ادبیت کا بھی بیش بہا ذخیرہ ہے۔ تفسیر میں کلام عرب اور اشعار جاہلیت سے استدلال کا طریقہ ابن عباسؓ نے سب سے پہلے شروع کیا تھا۔

اللباب من علوم الکتاب اس کے مؤلف ابو حفص عمر بن عادل حنبلی غالباً نویں صدی ہجری کے مفسرین میں سے ہیں۔ تفسیر علماء میں مشہور و مقبول ہے۔

تفسیر الجواہر الحسان اس کے مؤلف ابوزید عبدالرحمٰن بن محمد الثعالبی (۸۷۶ھ) ہیں اس کا رنگ قدیم تفاسیر جیسا ہے اور اس کی حیثیت دراصل تفسیر ابن عطیہؒ کی تلخیص کی سی ہے، گو اور بھی بہت سی تفاسیر سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

تفسیر نظم الدُّرر شیخ برہان الدین ابراہیم بن عمر البقاعی (ف ۸۸۵ھ) کی تالیف ہے۔ اس میں انہوں نے قرآن کے نظم و اسلوب ربطِ آیات اور ربطِ سُوَر کے اسرار و رموز بیان کیے ہیں۔

الدر المنثور علامہ جلال الدین سیوطیؒ (ف ۹۱۱ھ) نے تفسیر کے مختلف موضوعات پر بہت سی کتابیں لکھیں جن میں سے الدر المنثور بہت مشہور اور مستند ہے۔ باقی چند کتابوں کے نام یہ ہیں۔ ترجمان القرآن، الاتقان فی علوم القرآن، الاکلیل فی استنباط التنزیل، لباب المنقول، الناسخ والمنسوخ، معضلات القرآن، اسرار التنزیل، تکملہ تفسیر جلال الدین المحلی (جلالین) جس کے کئی حاشیے مثلاً الصادی اور الجمل وغیرہ چھپ چکے ہیں۔ جلالین مختصر درسی کتاب ہے۔ ان کے علاوہ مجمع البحرین نامی ایک تفسیر بھی ہے جو الدر المنثور سے زیادہ جامع ہے۔ الدر المنثور میں تفسیر کا مدار صرف روایات کو بنایا گیا ہے۔

ابو السعود اصل نام تو "ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم" ہے مگر مصنف ابو السعودؒ بن محمد العمادی (ف ۹۸۲ھ) کے نام سے ابو السعود مشہور ہے۔ اسرار بلاغت و عربیت اور وجوہِ اعجاز القرآن پر خصوصی ابحاث دی گئی ہیں۔

السراج المنیر شمس الدین محمد شربینی القاہری (ف ۹۷۷ھ) کی تصنیف ہے۔ دلائل کی پختگی، ربطِ آیات و سور اور قصص و روایات کا حسن و خوبی سے بیان اس کی خصوصیات ہیں۔

سواطع الالہام دربار اکبری کے مشہور رکن ابو الفیض فیضی (ف ۱۰۰۴ھ) کی بے نقط تفسیر ہے۔ اس سے علامہ فیضی کی عربی زبان میں مہارت ثابت ہوتی ہے، گو کسی اور لحاظ سے علماء نے اسے لائقِ التفات نہیں جانا۔

تفسیر ملا علی قاری مشہور محدث علامہ علی بن سلطان القاری حنفی (ف ۱۰۱۴ھ) کی تفسیر ہے، جو محدثانہ رنگ میں روایات و آثار کے لحاظ سے لکھی گئی ہے۔

تفسیر واحدی امام علی بن احمد بن محمد ابوالحسن الواحدی نیشاپوری (ف ۴۵۹ھ) کی تفسیر ہے۔ بقول امام سیوطیؒ یہ بزرگ اپنے زمانے کے یکتائے روزگار تھے اور ان کی تین تفسیر ہیں؛ وجیز، وسیط، اور بسیط۔ ان کے علاوہ ایک کتاب اسباب النزول نامی بھی لکھی ہے۔ الوجیز اور اسباب النزول چھپ چکی ہیں اور باقی کتابیں غیر مطبوعہ ہیں جو حلب اور موصل کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ تفسیر واحدی کا ذکر امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں بھی کیا ہے۔

تفسیر طوسی ابو جعفر محمد بن الحسنؒ بن علی طوسی شیعی (ف ۴۶۰ھ) کی تالیف ہے مؤلف کا پایہ شیعہ اہل علم و فن میں بہت بلند ہے۔ اس تفسیر کا نام البیان فی تفسیر القرآن ہے۔ بیس جلدوں میں ہے اور شیعی نقطۂ نظر کی خوب نمائندگی کرتی ہے۔

احکام القرآن ابن العربیؒ امام ابو بکر محمد بن عبداللہ بن العربی مالکی اندلسی (ولادت ۴۶۸ھ) نے احکام فقہ کے نقطۂ نگاہ سے مالکی فقہ کے مطابق لکھی ہے۔ ائمہ فقہ کے تمام اختلافات پر بحث کی ہے اور اس لحاظ سے یہ بہترین کتاب ہے۔ پہلے نامکمل چھپی تھی مگر اب مصر سے مکمل طور پر مع اشاریہ چھپ چکی ہے۔

تفسیر بغوی محی السنۃ امام ابو محمد حسینؒ بن مسعود الفراء البغوی (ف ۵۱۶ھ) کی تالیف ہے۔ کتاب کا نام معالم التنزیل ہے۔ اس میں مفسرین صحابہؓ و تابعین اور تبع تابعین کے اقوال و آثار جمع کیے گئے ہیں۔ مصنف کا پایہ حدیث و فقہ میں بھی بہت بلند تھا اور انہوں نے المصابیح اور شرح السنۃ حدیث میں اور کتاب التہذیب فقہ میں لکھی ہے۔ معالم التنزیل میں بھی فقہی و اجتہادی مسائل کا ذکر اکثر کرتے ہیں۔ یہ تفسیر علماء میں بہت مقبول و مستند ہے۔

تفاسیر اصفہانی شیخ ابوالقاسم اسماعیل بن محمد بن فضل تیمی طلحی (ف ۵۳۵ھ) نے کئی تفسیریں لکھی ہیں۔ بڑی کا نام الجامع ہے جو تیس جلدوں میں ہے۔ دوسری المعتمد دس جلدوں میں، تیسری الایضاح چار جلدوں میں اور چوتھی الموضح تین جلدوں میں ہے۔

تفسیر کشاف علامہ محمودؒ بن عمر زمخشری معتزلی (۵۳۸ھ) کی مشہور تفسیر ہے۔ جو لغت، نحو اور بلاغت و بیان کے زاویۂ نظر سے بیش بہا

کتاب ہے۔ تمام علماء ان علوم میں ان کی جلالتِ شان کے معترف ہیں۔ علامہ طیبیؒ امام ناصر الدین احمد بن منیر الاسکندری (ف ۶۸۳ھ) اور شیخ محمد عیان مرزوقی ازہری نے اس کی شرحیں اور حاشیے لکھے ہیں۔ شارحین نے ان کے اعتزال کا رد کیا ہے اور اس طرح اس کی قدر و قیمت بہت بڑھ گئی ہے۔ علامہ زمخشری مرحوم معتزلہ کے بہت بڑے عالم و داعی گزرے ہیں لہٰذا ان کی تفسیر میں بھی اعتزال کا گہرا رنگ موجود ہے۔

تفسیر ابن عطیہ متاخر

چوتھی صدی کے مفسرین میں ایک بزرگ ابن عطیہ کی تفسیر کا تعارف اوپر گزر چکا ہے، وہ ابن عطیہ متقدم اور زیر تعارف متاخر کہلاتے ہیں۔ ان کا نام ابو محمد عبد الحق بن ابی بکر بن غالب بن عطیہ غرناطی (ف ۵۴۲ھ) ہے۔ مختصر ہونے کے باوجود نہایت مفید اور معتبر تفسیر ہے، اور علمائے تفسیر نے اس کی تعریف کی ہے۔

تفسیر طبرسی

علامہ ابو علی فضل الحسین طبرسی (ف ۵۲۸ھ) کی تصنیف ہے جو شیعہ علماء میں بہت فاضل اور بلند پایہ عالم تھے۔ تفسیر میں ان کی دو کتابیں ہیں۔ ایک مجمع البیان اور دوسری جوامع الجوامع۔ عام طور پر تفسیر طبرسی سے پہلی کتاب مراد ہوتی ہے۔ ان کتابوں میں شیعہ نقطۂ نظر کی نمائندگی کی گئی ہے۔

تفسیر کبیر

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی (ف ۶۰۶ھ) کی بے نظیر تفسیر ہے اصل نام مفاتیح الغیب ہے۔ بعض لوگوں کا یہ کہنا غلط ہے کہ اس تفسیر میں تفسیر کے سوا سب کچھ ہے۔ صحیح تر بات یہ ہے کہ اس میں تفسیر کے سوا بھی بہت کچھ ہے۔ کلامی، لغوی، فقہی اور عقلی و نقلی لحاظ سے بے نظیر کتاب ہے۔ مصنف سنی عقائد کے زبردست وکیل تھے۔ لہٰذا یہی رنگ تفسیر میں بھی جھلکتا ہے۔ فرقِ باطلہ بالخصوص معتزلہ کا خوب خوب رد کیا ہے۔ نظمِ قرآن، ربطِ آیات اور سورتوں کے باہمی ربط پر بھی خاص توجہ مبذول کی گئی ہے۔ مختلف مفسرین کے اقوال و آراء پر بحث و تنقید کی گئی ہے اور بہت سی جگہوں پر صوفیاء اور معتزلہ کے ان خیالات کی تائید کی گئی ہے جو موافق عقل ہونے کے ساتھ ساتھ موافقِ قرآن بھی ہوں۔ یہ کتاب فہم قرآن کا سلیقہ پیدا کرتی ہے اور آیات سے احکام کے استخراج کی راہ ہموار کرتی ہے۔

تفاسیر ابن عربیؒ

مشہور صوفی بزرگ ابو بکر محی الدین ابن عربی (ف ۶۳۸ھ) نے تصوف کے رنگ میں تفسیر لکھی ہے، اس میں عجیب و غریب اشارات و تاویلات ملاحظے میں آتی ہیں۔

تفسیر الصافی ملا محمد محسن فیض شیعی (ف ۱۰۹۱ھ) کی تالیف ہے۔ موصوف کا شمار شیعہ کے اکابر علماء میں ہوتا ہے اور ان کی تفسیر شیعہ نقطۂ نظر سے بہت مستند اور مقبول ہے۔

تفسیر مظہری قاضی ثناء اللہ پانی پتی (۱۲۲۵ھ) کی بے نظیر تصنیف ہے جسے انہوں نے اپنے پیر و مرشد مرزا مظہر جانِ جاناں شہیدؒ کے نام سے معنون کیا۔ لغوی تشریح، روایات و آثار، فقہی مباحث، اسرارِ تصوف اور مسلکِ حنفی کی تائید و توثیق کے یہ ایک جامع تفسیر ہے مصنف کا پایہ متحدہ ہندوستان کے سُنی حنفی علماء میں بہت بلند تھا اور عمر بھر حدیث و فقہ سے شغف رہا۔

فتح القدیر علامہ محمد بن شوکانیؒ (ف ۱۲۵۰ھ) کی تالیف ہے جس میں انہوں نے معقول و منقول دونوں کو جمع کیا ہے۔ موصوف کا پایہ علم حدیث میں مسلم ہے، اور وہ فقہی مسالک کی تقلید سے تقریباً آزاد تھے۔ چنانچہ ان کے مباحثِ تفسیر میں یہ رنگ خاص طور پر نمایاں ہے۔

روح المعانی علامہ محمود بن عبداللہ آلوسی بغدادی (ف ۱۲۷۰ھ) کی مبسوط تفسیر ہے جس میں انہوں نے تمام اہم تفاسیر کا خلاصہ درج کر دیا ہے اور مشکلات القرآن کو حل کیا ہے۔ وہ روایت و درایت دونوں کے جامع ہیں۔ ردّ فرق باطلہ کے علاوہ نکاتِ تصوف بھی بیان کرتے ہیں۔ گویا یہ تفسیر فقہاء و متکلمین، محدثین اور صوفیاء سب کے طریقوں کی جامع ہے۔ بلاغت و معانی اور لغت و نحو کی تحقیق بھی کرتے ہیں اور جا بجا فقہی مسائل میں حنفی مسلک کی پر زور تائید کرتے ہیں۔ اشاراتِ تصوف کو بعض علماء نے آلوسیؒ کے معتے قرار دیا ہے۔ بہر حال متاخرین کی تفاسیر میں اس کتاب کا مقام نہایت رفیع ہے۔

بیسویں صدی عیسوی کا تفسیری سرمایہ

گزشتہ دو صدیوں سے سائنس اور ٹکنالوجی میں حیرت انگیز انقلاب رونما ہوئے مغرب میں عیسائیت نے مادیت کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے اور مادہ پرستی کا سیلاب مذہب کو بہا لے گیا۔ الحاد و تشکیک اور دہریت و انکارِ خدا کی زبردست تحریکیں اٹھیں جن کی رہنمائی بڑے بڑے فلاسفہ اور جدید علم و فن سے آراستہ و پیراستہ لوگوں کے

ہاتھ میں تھی۔ فطرتاً دنیا بھر کے ادیان و مذاہب اس سے شدید متاثر ہوئے۔ عیسائیت نے کئی صدیوں سے اسلام اور اہل اسلام کے خلاف بغض و عناد اور بہتان و اتہام کی جو شدید مہم چلا رکھی تھی اس کا رُخ اب اس نے ایک اور طرف کو پھیر دیا۔ وہ خود تو مادیت کے سیلاب کے سامنے ٹھہرنے کے قابل نہ تھی، چنانچہ شکست کھا گئی اور نام نہاد تہذیب جدید (بالفاظ صحیح تہذیبِ مادہ پرستی) کا دُم چھلا بن گئی۔ مگر جدید تہذیب و مادیت کے علم برداروں کو اسلام کے خلاف اکسانے اور تخریب اسلام کی کوششوں کو بیش از بیش تیز تر کر دینے میں وہ کامیاب ہو گئی۔ اس دور میں دنیا بھر کے اسلامی ممالک یا تو غلام بنا لیے گئے تھے یا آزادی کی جدوجہد کے آخری مراحل میں تھے۔ چنانچہ اسلام اور تہذیب جدید میں شدید تصادم ہو گیا اور یورپ اپنے سارے علم و فن کے اسلحہ سے اسلام اور اس کی شاندار روایات پر پل پڑا۔ مسلم ممالک میں الحاد و زندقہ اور دہریت کی حوصلہ افزائی کی گئی اور ایک جدید طبقہ ہر جگہ ایسا پیدا ہو گیا جو ذہن و دماغ کے لحاظ سے پورا مغربی لیکن مرز و بوم کے اعتبار سے مسلم یا مشرقی تھا۔ اب مسلمانوں میں ایک زبردست داخلی کشمکش شروع ہو گئی جس کا سلسلہ تا حال جاری ہے۔ اس زمانے میں بعض علمائے اسلام نے مختلف ممالک میں اسلام کی خدمت و دفاع کا صحیح کام کیا اور بہت سے لوگ جدید طوفان کی نذر بھی ہو گئے اس دور کا تفسیری سرمایہ اس لحاظ سے بڑا قیمتی ہے کہ اس میں کتاب و سنت اور علومِ اسلامیہ کی اکثر صحیح تعبیر و تفسیر ایسے طرز سے کی گئی ہے جس سے جدید ذہن کے شکوک و شبہات رفع ہوں اور وہ احساس کہتری کو چھوڑ کر اپنا صحیح مقام حاصل کرے۔ بعض مشہور تفاسیر کے نام یہ ہیں:

تفسیر المنار اس کے مؤلف علامہ محمد رشید رضا طرابلسی لبنانی ثم مصری (ف ۱۳۵۴ھ) ہیں۔ انہوں نے بارہ اجزاء کی تفسیر لکھی ہے، اگر عمر وفا کرتی تو شاید تکمیل کی نوبت بھی آ جاتی۔ مفردات کی حقیقت کا بیان، تفہیم اسالیب قرآن، احوال و کوائف بشریہ کا بیان، قرآن کے ہادیٔ عام اور آخری کتاب ہونے کے عقلی و نقلی دلائل، سیرت سلف سے استدلال، شکوک و شبہات کا رد، مستشرقین کے اعتراضات کا رد، جدید علوم کی روشنی میں ہدایتِ ربانی کا اطمینان بخش بیان وغیرہ اس کی خصوصیات ہیں۔ تفصیل بسرہ ہماری تفسیر المائدہ والنساء کے مقدمہ میں دیکھئے۔

تفسیر الجواہر طنطاوی علامہ جوہری طنطاوی (ف ۱۳۵۹ھ) کی تالیف ہے۔ مقصد تو ان کا یہ تھا کہ امام رازیؒ کی طرح

علوم جدید اور سائنس کو خدمتِ قرآن کے لیے کام میں لائیں لیکن افسوس معاملہ کچھ الٹ ہو گیا۔ ان پہ جدید فلسفہ و سائنس اور علوم عمران کا اس قدر غلبہ اور رعب تھا کہ انہوں نے قرآن کو خواہ مخواہ ان کے مطابق کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ حالانکہ علوم کونیہ و عمرانیہ دم بدم تغیر پذیر ہیں اور قرآن ایک اٹل اور لازوال حقیقت ہے۔ یہ تفسیر علوم سائنس سے بھری ہوئی ہے۔ مصنف کا جذبہ تو بے شک قابل قدر ہے لیکن جو کچھ انہوں نے بیان کیا ہے اسے تفسیر قرآن بہر حال نہیں کہا جاسکتا۔

تفسیر المراغی علامہ احمد مصطفیٰ (ریڈر فلسفہ علوم شریعہ و لغت عربی دار العلوم قاہرہ) کی متوسط تفسیر ہے، جس میں انہوں نے جدید و قدیم کا حسین ترین امتزاج کر دیا ہے۔ مفصل تعارف ہماری تفسیر المائدہ والنساء کے مقدمہ میں دیکھا جائے۔

فی ظلال القرآن سید قطب شہیدؒ (۱۹۶۶ء) کی مبسوط تفسیر ہے جو انہوں نے مصر کی جیلوں میں تنہائیوں میں لکھی تھی۔ مفصل تعارف ہماری تفسیر المائدہ والنساء کے مقدمہ میں دیکھا جائے۔

التفسیر الحدیث مؤلفہ علامہ محمد عزہ دروزہ، جو زمانۂ حال کے ایک مشہور عالم ہیں۔ اس تفسیر کی خاص بات یہ ہے کہ ترتیب تلاوت کو چھوڑ کر تفسیر کے لیے ترتیب نزول کو اختیار کیا گیا ہے۔ ربط آیات، مناسبت سُوَر، اخلاقی، اجتماعی اور عمرانی فوائد اور لغوی و بیانی تشریح اس تفسیر کے خصائص ہیں۔ روایات کا بھی ایک مناسب حصہ درج کیا گیا ہے۔ ہر سورہ کی ابتداء میں مفید نوٹ ہیں، جن میں مضامین کا اجمالی خاکہ دیا گیا ہے۔

اضواء البیان فی ایضاح القرآن دور حاضر کے ایک اور فاضل محمد الامین الجکنی کی تالیف ہے۔ کچھ حصہ چھپ چکا ہے اور باقی زیر طباعت ہے۔ تفسیر القرآن بالقرآن، حدیث و سنت اور فقہ پہ موقع بہ موقع مناسب گفتگو اس کی خصوصیت ہے۔

نظام القرآن و تاویل القرآن مؤلفہ مولانا حمید الدین فراہیؒ (ف ۱۳۴۹ھ) اس میں نظم قرآن، تفسیر القرآن بالقرآن، معانی و بلاغت، ربطِ آیات و سُوَر کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ روایات کا ذکر کم ہے۔ مؤلف عربی کے جدید فضلاء میں سے تھے اور فہم قرآن کا خاص ملکہ رکھتے تھے۔ پوری تفسیر نہیں لکھ

سکے اور خمس قدر لکھی ہے اس کا اردو ترجمہ تفاسیر فراہی کے نام سے مولانا امین احسن اصلاحی نے کیا ہے جو چھپ چکا ہے۔

نوٹ: چونکہ پاک و ہند کے تفسیری ادب پر ہم اگلے باب میں مستقل عنوان کے تحت گفتگو کر رہے ہیں، اس لیے اوپر کے ادوار میں عربی تصانیف کے ذکر پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔ نیز دورِ جدید میں قرآن پاک کے ترجمہ و تفسیر کا رواج دنیا بھر کی مشہور زبانوں میں ہو چکا ہے بعض کتب ترجمہ و تفسیر کا ہمیں علم ہے اور اکثر کا نہیں۔ اس مختصر کتابچے میں ان کا ذکر نہ مفید ہے نہ ممکن۔ واللہ ولی التوفیق۔

برِّصغیر پاک و ہند کا تفسیری لٹریچر

● قرآن مجید کی ہزاروں لاکھوں تفاسیر لکھی گئی ہیں، دوسری خصوصیات کی مانند تفسیر و ترجمہ اور توضیح و تفہیم کے ضمن میں بھی قرآن دنیا کی ایک منفرد کتاب ہے جتنی تفسیریں اس کی لکھی گئیں، دنیا کی کسی کتاب کی نہیں لکھی گئیں۔ علماء نے مفسرین کی فہرست میں شامل ہونے کو باعثِ سعادت جانا اور ہر دور میں قرآن کی خدمت پر کمربستہ رہے۔ برِّعظیم پاک و ہند کی ہر قابلِ ذکر زبان مثلاً اردو، پنجابی، سندھی، پشتو، بنگالی، مرہٹی، تامل، ہندی، کشمیری، گجراتی وغیرہ وغیرہ میں اس کتاب پاک کے ترجمے اور تفاسیر لکھی گئیں۔ اس کے علاوہ عربی اور فارسی زبانوں میں بھی تفاسیر و تراجم کا ایک معتدبہ ذخیرہ تیار ہوا۔ اوپر ہم دو عربی تفسیروں (مظہری اور نظام القرآن) کا ذکر کر چکے ہیں۔ ذیل میں نہایت اختصار کے ساتھ دیگر تفاسیر کا تعارف کرائیں گے۔

التفسیرات الاحمدیہ

اس کتاب کے مصنف شیخ احمد ملا جیون (ف ۱۱۳۰ھ) شاہ اورنگ زیبؒ عالمگیر کے استاد تھے۔ علومِ شرعیہ میں ان کی مہارت مسلّم ہے، خاص طور پر اصولِ فقہ میں انہیں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اصولِ فقہ کی مشہور درسی کتاب نور الانوار کے مصنف وہی ہیں۔ اس تفسیر میں انہوں نے صرف ان آیات کو لیا ہے جن سے فقہی احکام کا استنباط ہوتا ہے۔

خاندانِ ولی اللّٰہی کی تفسیری خدمات

برِّعظیم پاک و ہند میں خدمتِ اسلام و خدمتِ علومِ اسلامیہ کی جو توفیق اللہ تعالےٰ

نے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (ف ۱۱۷۶ھ) اور ان کے خاندان کو عطا فرمائی، کسی اور کو کم ہی ملی ہو گی۔ شاہ صاحب نے سادہ تفہیم قرآن کا ایک خاص طریقہ ایجاد کیا جو ان کے خاندان میں جاری ہوا۔ اس سلسلے میں انہوں نے اپنے زمانہ کی مخالفت کے باوجود قرآن پاک کا فارسی ترجمہ لکھا اور اس کے حاشیے پر مختصر تفسیر بھی کہیں کہیں درج فرمائی۔ فارسی اس وقت سرکاری زبان تھی اس لیے انہوں نے اس زبان کو چنا۔ اس کا نام فتح الرحمن فی ترجمۃ القرآن رکھا۔ اس کے علاوہ الفوز الکبیر کے آخر میں قرآن پاک کے مشکل مقامات کی عربی تفسیر بھی مختصر لکھی۔ اپنی مستقل تصانیف مثلاً حجۃ اللہ البالغہ، ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء، تفہیمات الٰہیہ، الخیر الکثیر وغیرہ میں قرآن پاک کی جو جستہ جستہ تفسیر اور دیگر مباحث پر گفتگو کر چکے تھے، یہ ترجمہ و تفسیر ان کے علاوہ تھی۔ وہ خود فتح الرحمن کا درس دیتے رہے اور اس طرح قرآن کریم کی تفہیم کا ایک نیا باب کھولا۔ اپنی وصیت میں بھی اسی طریقہ کی طرف رہنمائی فرمائی ہے۔

شاہ ولی اللہ کے صاحبزادگان میں سے شاہ عبدالعزیزؒ (ف ۱۲۳۹ھ) نے فتح العزیز (المعروف تفسیر عزیزی) کے نام سے قرآن پاک کی مکمل تفسیر لکھی۔ اگرچہ وہ مکمل شائع نہ ہو سکی مگر قرائن بتاتے ہیں کہ لکھی مکمل تھی، کیونکہ مختلف قلمی نسخے جو کتب خانوں میں ہیں ان سے یہی پتہ چلتا ہے، اور اس کا کچھ حصہ اصل فارسی میں شائع ہو چکا ہے۔ آخر دو پاروں کا اردو ترجمہ محمد حسن خاں شیدا نے کیا۔ بعض اور حصوں کے ترجمے بھی شائع ہو چکے ہیں۔

شاہ عبدالقادرؒ (ف ۱۲۳۰ھ) نے اپنے والد محترم کے فارسی ترجمہ فتح الرحمن کو با محاورہ اردو میں ڈھالا اور اس پر بعض مقامات پر تفسیری اشارات بھی اردو میں لکھے جو موضح القرآن کے نام سے پاک و ہند میں شائع و ذائع ہے۔ بعد کے اردو مترجمین نے اسی کو بنیاد بنایا ہے۔

شاہ رفیع الدینؒ (۱۲۳۳ھ) نے تحت اللفظ اردو ترجمہ کیا جو پہلے ترجمے کی طرح مشہور و مقبول ہے۔

ترجمان القرآن

نواب صدیق حسن خاں بھوپالی (۱۳۰۷ھ) نے فتح القدیر شوکانیؒ کی تلخیص لکھی جو ابتداء سے سورہ کہف تک اور آخری دو پاروں پر مشتمل تھی۔ اس کا تکملہ مولانا محمد بن ہاشم لاہوری و مولانا ذوالفقار احمد بھوپالی نے لکھا۔ نواب صاحبؒ نے فتح البیان اور نیل المرام کے نام سے دو اور عربی تفسیریں لکھیں۔

تفسیر سعیدی ملا حسین واعظ کاشفی کی تفسیر حسینی کا اردو ترجمہ ہے جو مولانا عبدالرحمٰن بخاری نے کیا اور لکھنؤ میں چھپا ہے۔

تفسیر القرآن مؤلفہ سرسید احمد خانؒ (۱۳۱۵ھ) جو سولہ پاروں کی تفسیر پر مشتمل ہے۔ تفسیر بالرائے ہونے کی وجہ سے لوگوں میں مقبول نہیں ہوئی اور اس کا فوری ردّ بھی کئی لوگوں نے شائع کر دیا تھا، مثلاً تنقیح البیان از سید ناصر الدین اور البرہان از محمد علی مراد آبادی۔

تفسیر حقانی از مولانا ابو محمد عبدالحق حقانی (ف ۱۳۳۵ھ) اصل نام فتح المنان ہے جس کے ساتھ ایک فاضلانہ مقدمہ بنام البیان فی علوم القرآن لکھا تھا۔ مفصل تعارف ہماری تفسیر المائدہ والنساء وغیرہ کے مقدمہ میں ملاحظہ کیجئے۔ اس تفسیر کا ایک اختصار بھی قرآن پاک کے حاشیہ پہ شائع ہو چکا ہے۔

احسن التفاسیر از مولانا احمد حسنؒ دہلوی (ف ۱۳۳۸ھ) مع ترجمہ شاہ عبدالقادرؒ محدث دہلوی۔ پہلے یہ تفسیر کرزن گزٹ دہلی میں شائع ہوتی رہی۔ جدید ایڈیشن مع تخریج احادیث مکتبہ سلفیہ لاہور نے تین جلدوں میں شائع کیا ہے۔

ترجمہ و تفسیر حیرت دہلویؒ مرزا حیرتؒ دہلوی اپنے گوناگوں اوصاف کے لحاظ سے ایک پُر لطف اور عظیم شخصیت گزرے ہیں۔ یہ ترجمہ و تفسیر انہی کا ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے ان کی غلطیوں کی اصلاح کے لیے ایک خاص رسالہ لکھا ہے۔ مرزا حیرت کا انگریزی ترجمۂ قرآن بلا متنِ قرآن شائع ہو چکا ہے۔

عام فہم تفسیر قرآن خواجہ حسن نظامیؒ دہلوی (ف ۱۹۵۳ء) نے اس تفسیر کے علاوہ ایک تفسیر جہانگیر اور کچھ حصّہ سیاسی تفسیر کا بھی لکھا ہے۔ ہندی زبان میں بھی ایک ترجمہ شائع کیا۔ بعض فضلاء نے اس پر تعقب کیا اور اس کی اغلاط شائع کیں۔

تفسیر ثنائی مشہور مبلغ و مناظرِ اسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری (ف ۱۳۶۷ھ) کی تالیف ہے۔ اوسط درجہ کی مختصر تفسیر ہے اور اس میں خصوصی لحاظ ردّ فرقِ باطلہ اور ردّ اعتراضات و شبہاتِ دشمنانِ اسلام کا رکھا گیا ہے۔ بعض علماء (خصوصاً روپڑی اہل حدیث حضرات) نے مولانا مرحوم پر تعقب کیا اور ان کی اغلاط واضح

ٹھوکر کھائی ۔ مجموعی طور پر یہ تفسیر نہایت مہتم بالشان ہے ۔

کنز الایمان فی خزائن القرآن کنز الایمان اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ (ف ۱۳۴۰ھ) کا ترجمۂ قرآن ہے جس پر کچھ حواشی لکھے گئے ہیں، زیر تبصرہ حواشی مولانا نعیم الدینؒ مراد آبادی کے ہیں ۔ پہلے مراد آباد سے اور پھر لاہور سے باہتمام تاج کمپنی شائع ہوا ۔

بیان القرآن اردو زبان میں اس سے زیادہ مستند اور معتبر تفسیر ابھی تک شائع نہیں ہوئی ۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ (ف ۱۳۶۲ھ) کی تالیف ہے ۔ اس کی تعریف علامہ انور شاہ کشمیریؒ نے شاندار الفاظ میں کی ہے ۔ مولانا عبد الماجد دریابادی نے اسے اردو تفاسیر کا سرتاج لکھا ہے ۔ منقول و معقول حل لغات، معانی و بیان، اشاراتِ تصوف، ردّ شبہات، ردّ فرق باطلہ وغیرہ میں بے مثال چیز ہے ۔ بار ہا چھپ چکی ہے ۔ اس میں زبان و بیان کا وہ طرز نہیں جو جدید تعلیم یافتہ حضرات کو متاثر کر سکے ۔ مولانا نے ربطِ آیات کے موضوع پر ایک عربی تفسیر بھی لکھی ہے ۔

تفسیر الحسنات مولانا ابو الحسنات محمد احمد قادریؒ (ف ۱۳۸۰ھ) کی تصنیف ہے جو ۲۸ پارے تک لکھی گئی تھی ۔ تاحال پوری شائع نہیں ہو سکی ۔ مفردات کے معانی اور مطالب آیات کا التزام کیا گیا ہے ۔

ترجمان القرآن مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم (ف ۱۹۵۸ء) سے سیاسی اختلاف کے باوجود یہ حقیقت مسلّم ہے کہ فصاحت و بلاغت، وسعتِ مطالعہ، حیرت انگیز حافظ اور ہر علم و فن کی کثیر معلومات میں ان کا مقام بہت بلند تھا ۔ انہوں نے جدید تقاضوں کے مطابق ترجمان القرآن کے نام سے ابتداء سے سورۂ مومنون تک دو جلدوں میں ایک بے مثل تفسیر لکھی ۔ افسوس وہ اسے مکمل نہ کر سکے اور ان کی وفات کے بعد باقیاتِ ترجمان القرآن اور ترجمان القرآن جلد سوم کے نام سے دو جلدیں اور شائع ہوئی ہیں ۔ لیکن یہ محض ان کی مختلف تحریروں میں آئے ہوئے تفسیری مباحث ہیں جنہیں شائع کر دیا گیا ہے ۔ ان کی زندگی میں اس تفسیر پر وحدتِ ادیان اور متحدہ قومیت وغیرہ کے سلسلے میں اعتراضات ہوتے تھے جن کا جواب انہوں نے میرا عقیدہ نامی تحریر میں دیا اور بات صاف ہو گئی ۔ وہ ہر قسم کی تقلیدی بندشوں سے آزاد تھے اور جدید مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے بعض جدید مسائل (مثلاً نظریۂ ارتقاء) میں

ترجمہ قرآن عزیز مع تفسیری حواشی از مولانا احمد علی شیخ التفسیر لاہوری (ف ۱۹۶۲ء) یہ ترجمہ و تفسیر بہت مشہور ہے۔ بعض مقامات پر مولانا اشرف علی تھانوی نے تعقب کیا ہے۔

فوائد القرآن: از شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی (ف ۱۹۴۹ء) جو انہوں نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کے ترجمہ پر لکھے مفصل تعارف ہماری تفسیر المائدہ دنساء میں دیکھئے۔

تفسیر القرآن بالقرآن از ڈاکٹر عبدالحکیم خاں پٹیالوی (ف ۱۹۴۰ء) یہ تفسیر موصوف نے دور احمدیت میں لکھی تھی۔ بعد میں احمدیت کو چھوڑا تو بعض مقامات کی تصحیح کی اور اسے تفسیر کے ساتھ شائع کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب بہت سی تصانیف کے مالک ہیں۔ بائبل پر خوب نظر ہے۔ لیکن تفسیر قرآن کا حق ادا نہیں کر سکے۔

تفسیر حیدری حضرت امام حسن عسکری کی طرف منسوب تفسیر کا اردو ترجمہ جناب محمد باقر زیدی نے کیا ہے، جو کچھ عرصہ پہلے شائع ہوا ہے۔

تفسیر بیان القرآن لاہوری اردو ترجمہ و تفسیر (اسی طرح انگریزی بھی) مولانا محمد علی سابق امیر احمدیہ انجمن اشاعت اسلام (لاہوری قادیانی جماعت) نے شائع کیا تھا۔ جدید پڑھے لکھے لوگوں میں انگریزی ترجمہ و تفسیر بہت مشہور ہوا۔ لیکن ان کے وہ خاص عقائد و خیالات جو عقیدۂ اہل سنت (بلکہ تمام اہل اسلام) کے خلاف تھے، ان کے باعث اسے وہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جو اس کا حق تھی۔ مولانا محمد علی کثیر المعلومات اور کثیر التصانیف شخص تھے۔

ترجمہ و تفسیر مقبول دہلوی اصل نام "تفسیر مطابق روایات ائمہ اہل بیت کرام" ہے۔ مولوی مقبول احمد دہلوی (ف ۱۳۴۰ھ) نے یہ ترجمہ و تفسیر شیعہ اثنا عشریہ کے عقائد و روایات کے مطابق لکھا ہے۔ اس کے حواشی بموجب حکم سابق گورنر پنجاب ملک امیر محمد خاں مرحوم ضبط ہو گئے تھے۔

تفسیر وحیدی مولانا وحید الزمان نواب وقار نواز جنگ بہادر (ف ۱۹۲۰ء) نے ترجمہ و تفسیر سلفی عقائد کے مطابق لکھا ہے، جو الگ بھی اور تبویب القرآن کے ساتھ بھی شائع ہوا ہے

مفہوم القرآن مسٹر غلام احمد پرویز نے اپنے رنگ میں (وہ منکرِ حدیث ہیں) قرآن کا مفہوم لکھا ہے جو نہ تو ترجمہ ہے نہ تفسیر، بلکہ صرف قرآنی آیات کا مفہوم پیش کیا ہے۔ پرویز صاحب کی اور بھی متعدد تصانیف ہیں جن میں کسی کو بھی تفسیر کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ ہاں زبان وادب کی چاشنی ان میں ضرور موجود ہے۔

تفسیر کبیر و تفسیر صغیر مرزا بشیر الدین محمود احمد (ف ۱۹۶۸ء) خلیفۂ ثانی قادیانی کی تصانیف ہیں۔ مرزا صاحب کوئی پڑھے لکھے آدمی تو نہ تھے لیکن ذہین ضرور تھے۔ انہوں نے بہت سی ایسی چیزیں تفسیر کے نام سے ان کتابوں میں بھر دی ہیں کہ پڑھ کر ہنسی ہی آجاتی ہے۔ ویسے ان کے مستعد اور منتظم آدمی ہونے میں شک نہیں۔

لوامع البیان مرزا احمد علی (ف ۱۹۷۰ء) اثنا عشری نے قرآن پاک کا ترجمہ وحواشی شیعی نقطۂ نگاہ سے لکھے ہیں جو کتب خانہ حسینیہ لاہور نے شائع کیے۔

کشف الرحمٰن مع تیسیر القرآن سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی مرحوم کا ترجمہ و تفسیر ہے۔ اس کے علاوہ فاتحۃ الکتاب کے نام سے ایک اور تفسیر الگ شائع کی ہے۔

تفسیر ماجدی مولانا عبدالماجد دریابادی مدیر صدق لکھنؤ نے پہلے انگریزی میں ترجمہ و تفسیر شائع کی جو نہایت بلند پایہ تفسیر ہے۔ پھر انہوں نے اس کی تلخیص مع اردو ترجمہ لکھی جو تاج کمپنی لاہور نے شائع کی ہے۔ دوسرا ایڈیشن مصنف کی نظرِ ثانی کے بعد حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ تفسیری نقطۂ نگاہ سے بہت قیمتی مواد جمع کر دیا گیا ہے۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے بالخصوص نہایت مفید ہے۔ مفصل تعارف کے لیے دیکھیے مقدمہ تفسیر النساء۔ از احقر مرتب۔

تفہیم القرآن سید ابوالاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی کی تفسیر ہے، جو پہلے ان کے رسالہ ترجمان القرآن میں بلا متنِ قرآن شائع ہوئی ہے پھر بصورت تفسیر کتابی شکل میں۔ اب تک چار جلدیں شائع ہو چکی ہیں مفصل تعارف کے لیے ہماری تفسیر النساء کا مقدمہ ملاحظہ فرمائیے۔

تدبّرِ قرآن از مولانا امین احسن اصلاحی۔ اپنے مضامین و موضوعات کے لحاظ سے منفرد اردو تفسیر ہے۔ دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ "تدبرِ قرآن" مصنف کا خاص موضوع ہے اور انہوں نے واقعی قرآن پہ تدبر کیا ہے۔

غرائب القرآن ڈپٹی نذیر احمد دہلوی (ف ۱۳۳۱ھ) نے قرآنِ پاک کا ترجمہ و تفسیر (حواشی) لکھی جس کے زبان و بیان پہ علماء نے گرفت کی۔ مولانا تھانویؒ نے "اصلاح ترجمۂ دہلویہ" نامی رسالہ لکھا۔ مولانا نذیر احمد مرحوم ایک آزاد منش عالم تھے اور بہت سی کتابوں کے مصنف بھی۔

ان مذکورہ کتب و تراجم کے علاوہ پاکستان و ہند کی ہر قابلِ ذکر زبان میں تفسیر کے قابلِ قدر ذخائر موجود ہیں۔ فارسی اور اردو میں بالخصوص بہت سی تفاسیر لکھی گئی ہیں اگر ان سب کا ذکر کیا جائے تو اس کے لیے دفتر درکار ہیں۔ مشہور رسالہ سیارہ ڈائجسٹ نے قرآن نمبر کے نام سے تین شمارے شائع کیے ہیں، مزید تفصیل کے طالب ان کی طرف رجوع کریں۔

پاک و ہند میں اللہ تعالیٰ نے ایسے علماء و مفکرین کو پیدا فرمایا جن میں سے بعض عالمی شہرت کے مالک ہوئے۔ یہاں غلط اور صحیح ہر قسم کی تحریکیں بھی اٹھیں۔ دورِ غلامی میں (اور اس کے بعد بھی) شدید فرقہ بندی کا رواج رہا۔ جدید نبوتوں کے داعی یہاں پیدا ہوئے اور متعدد اسباب و وجوہ کی بنا پہ ان کی جماعتوں نے خاصا زور پکڑ لیا۔ اس لیے ہر قسم کے لٹریچر کے ساتھ ساتھ ہر نقطۂ خیال کا تفسیری لٹریچر بھی وجود میں آیا۔ اس مختصر رسالے میں تفصیل کا موقع نہیں، ہم نے صرف اشارات اور بعض کتبِ تفسیر کے مختصر تعارف پہ اکتفا کیا ہے۔ سندھی، بنگالی، پشتو اور پنجابی زبانوں میں بھی تفسیرِ قرآن پہ کافی کچھ لکھا گیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شاہ ولی اللہ کی مختصر سوانح حیات اور کارنامے

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ایک جید عالم اور صوفی بزرگ شاہ عبدالرحیم کے صاحبزادے تھے۔ شاہ ولی اللہ کے دادا شیخ وجیہ الدین شاہ اورنگ زیبؒ عالمگیر کے ایک معتقد درباری اور بہادر فوجی افسر تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت فاروقِ اعظمؓ سے ملتا ہے۔ ان کے آباؤ اجداد میں سے مفتی شمس الدین وہ بزرگ تھے جو یہاں مسلم اقتدار کی ابتداء میں ہندوستان آکر رہتک میں بس گئے تھے۔ بعد میں یہ خاندان دہلی چلا گیا۔

شاہ ولی اللہ کی پیدائش عالمگیرؒ کے اواخر حکومت میں ۱۱۱۴ھ ۴ شوال کو ہوئی۔ ابتدائی تعلیم و تربیت والد ماجد کی زیر نگرانی ہوئی۔ ختم قرآن مجید اور تحصیل فارسی کے بعد عربی علوم شروع کیے اور پندرہ سال کی عمر میں والد کے حکم سے تعلیم و تدریس کی گدی پہ بیٹھ گئے۔ ۱۱۴۳ھ میں حج و زیارت سے مشرف ہوئے اور تقریباً تین سال حجاز میں رہ کر علوم حدیث کی تکمیل کی۔ حدیث میں ان کے استاد شیخ ابو طاہر مدنی تھے۔ ہندوستان واپس آکر درس و ارشاد کی مسند سنبھالی۔ والد کا انتقال پہلے ہی ہو چکا تھا، اب وہ مستقلاً کم و بیش ۳۰ برس تک تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔

علمی کارنامہ

شاہ ولی اللہ کا دور مسلمانوں کا دورِ زوال تھا۔ معاشرت، معیشت، سیاست اور علم و فن ہر شعبہ زندگی میں مسلمانوں کی عظمت کو گھن لگ چکا تھا۔ ہندوستان میں طوائف الملوکی جیسی کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ مغل اعظم شاہ اورنگ زیب عالمگیر غازیؒ کے بعد کوئی ایسا قابل حکمران پیدا نہ ہوا جو مسلمانوں کو متحد رکھ سکتا۔ سلطنت کی چولیں ہل گئی تھیں۔ مرہٹے، راجپوت اور سکھ مملکت کے اطراف میں قتل و غارت کر رہے تھے۔ روزانہ کسی نہ کسی طرف سے کوئی وحشتناک خبر آتی تھی۔ مسلمان علم و عمل میں میدان سے پیچھے ہٹ رہے تھے۔ بیرونی ڈاکو تاجروں کے بھیس میں ملک پہ حملہ آور تھے اور روز بروز اپنا اثر و رسوخ بڑھا رہے تھے۔ سپاہی میں جوشِ شجاعت، امراء میں کرم و سخاوت، علماء میں اجتہادی روح اور عوام میں عمل و اعتماد کا جذبہ باقی نہ تھا۔ شاہ صاحبؒ نے اس ساری صورتِ حال پہ گہرا غور کیا اور دین سے اس کا علاج ڈھونڈ نکالا۔ انہوں نے تصنیف و تالیف کے ذریعے سے اسلام اور

مسلمانوں کی بے پناہ خدمات انجام دیں۔ شکوک وشبہات دور کیے۔ آنے والے طوفان کو بھانپ کر قبل از وقت اس کا علاج تجویز کیا۔ ان کی تصنیفات کتاب وسنت، فقہ، اصولِ فلسفہ وعلومِ عمران، معاشیات، ردِّ فرقِ باطلہ، حکمتِ دین، تصوف اور علوم باطنی غرض اس زمانے کے ہر معقول ومنقول پہ حاوی ہیں۔ علومِ حدیث کو ان دیار میں عام کرنے کا سہرا شاہ صاحبؒ ہی کے سر ہے۔ پاکستان وہند کے تمام حدیث کے سلسلوں کی سند ان تک پہنچتی ہے، انہوں نے تمام مذاہب فقہ کو یکجا اور قریب تر کرنے کی شدید کوشش کی۔ ان کی شرح مؤطا (مصفیٰ ومسویٰ) اس کی روشن دلیل ہے۔ وہ خود حنفی تھے مگر تعصب اور جانبداری نام کو نہ تھی۔ فقہی اختلاف کے حل پہ ایک مستقل رسالہ بھی تصنیف کیا۔ علم اصولِ تفسیر میں تو ان کی کتاب انفرادیت بلکہ اولیت کا درجہ رکھتی ہے۔ تفہیم قرآن میں انہیں خاص ملکہ تھا اور اس شغف کے پیشِ نظر قرآن کا پہلا فارسی ترجمہ مع مختصر تفسیر "فتح الرحمٰن" کے نام سے تحریر کیا۔ حکمتِ دین ان کا خاص موضوع تھا اور ان کی تصنیف حجۃ اللہ البالغہ اس سلسلے میں منفرد ہے۔ الخیر الکثیر اور تفہیمات الٰہیہ کو بھی اس ضمن میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ خلافتِ راشدہ کے نظام کو از سرِ نو زندہ کرنے کی ایک خاص کوشش ان کی کتاب "ازالۃ الخفاء" میں نظر آتی ہے۔ ہندوستان کے خاص حالات میں یہ ان کا ایک عظیم اور زندہ کارنامہ ہے۔

تجدید واصلاح

شاہ صاحبؒ کا ذہن ایک دردمند مسلم کا صحیح انقلابی ذہن تھا۔ انہوں نے اپنی خانقاہ اور مدرسہ رحیمیہ کے حجروں سے حکومت، امراء، فوجیوں، علماء، مشائخ اور عوام کو للکارا اور خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لیے انہیں جھنجوڑا۔ ہر طبقے کی غلطیاں واضح کیں اور فرائض یاد دلائے حقیقت میں ان کا تجدیدی کام انہیں مجددینِ امت میں ایک ممتاز مقام دلاتا ہے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ مسلمانوں پہ زوال وجمود کون سے راستوں سے حملہ آور ہے۔ انہوں نے انہی راستوں کی نشاندہی کی اور طوفان کے آگے بند باندھنے کی کوشش کی۔ مرجانے والے نظام معیشت کے مقابلے میں انہوں نے اسلام کا زندۂ جاوداں نظامِ معیشت پیش کیا جس کی بنیاد عدلِ عمرانی پہ ہے۔ مزدور اور کاشت کار کے حقوق کا تعین کیا اور سرمایہ دار کو عیش وعشرت کے خطرناک عواقب سے آگاہ کیا۔ رائج الوقت سیاسی نظام کی جگہ اسلام کا متوازن نظامِ خلافتِ راشدہ زندہ کرنے کی تحریک کی۔ اور اس کے خلاف جس قدر شکوک وشبہات تھے، یا ہو سکتے تھے، ان سب کا جواب دیا۔ انہوں نے وقت کی معاشرت

پر کڑی تنقید کی۔ مسلمانوں میں غیر مسلموں کے اثر و نفوذ سے جو معاشرتی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں، ایک ایک کر کے ان کی نشاندہی کی اور انہیں دور کرنے کی دعوت دی۔ طبقۂ امراء کی کم کوشی و عیش پسندی پر انہیں تاڑا اور بتایا کہ تمہارا طرزِ زندگی عوام، حکومت اور سارے معاشرے کو تباہی کی طرف لے جا رہا ہے۔ علماء و مشائخ کے جمود باہمی آویزش، بے عملی، اندھی تقلید، نئی بدعات پر باہمی چپقلش، ریاکاری، دنیا پرستی اور حکام دنیا کی پرستش پر انہیں سخت سرزنش کی۔ اور بتایا کہ تم میں علماءِ سُوء اور مشائخ یہود جیسی خصلتیں پیدا ہو چکی ہیں۔ جب تک تم انہیں ترک نہ کرو گے، علم و فضل اور تربیت و ارشاد کی گدیوں پر تمہارا براجمان رہنا ناجائز ہوگا۔

انہوں نے حکام و امراء اور فوجی سالاروں کو خطاب کرتے ہوئے ان کی جہالت، غفلت، سست روی اور بدعملی پر شدید احتجاج کیا۔ عوام کو مشرکانہ رسوم پر تاڑا اور اسلام کی کھری اور صاف توحید کی طرف بلایا۔

اپنے جانشینوں اور شاگردوں کی ایک خاصی جماعت شاہ صاحبؒ نے ایسی تیار کی جس نے ان کی وفات کے بعد ان کے علمی و عملی اور اصلاحی کام کو آگے بڑھایا۔ خاندانِ ولی اللّٰہی کا ہر فرد ایک چراغِ ہدایت بن کر چمکا۔ شاہ صاحبؒ ایک تحریک ساز شخصیت ثابت ہوئے اور ان کے بعد جو بھی سیاسی، اصلاحی، دینی، معاشرتی تحریک اٹھی، اس کے ڈانڈے اوپر جا کر ولی اللّٰہی تحریک سے مل جاتے ہیں۔ تحریکِ مجاہدین، تحریکِ دیوبند، ندوۃ العلماء، سرسید کی علمی تحریک، مسلم لیگ کی تحریکِ پاکستان، سیاسی جماعتوں کی تحریکِ آزادی، یہ سب تحریکیں بلاواسطہ یا بالواسطہ شاہ صاحب کے کاموں اور تحریک سے متاثر تھیں۔

مرکزیتِ قرآن و سنت اور شاہ صاحبؒ

شاہ ولی اللہؒ نے علمی دلائل سے (مزین)

تقلید اور جمود کے خلاف شدید احتجاج کیا اور ابنائے زمانہ کی روش کے خلاف تعلیم و تدریس کے نظام میں قرآنِ پاک کو اولیں اور مرکزی حیثیت دی۔ فقہی اور کلامی اختلاف سے گریز کرتے ہوئے براہِ راست کتاب و سنت سے استفادہ کی تحریک چلائی۔ ان کا ترجمہ قرآن فتح الرحمن اسی سلسلے کی ایک عظیم کڑی ہے۔ ان کے نزدیک تعلیم قرآن کا پرانا ڈھنگ زنگ خوردہ اور بوسیدہ ہو چکا تھا، لہٰذا قرآن کے سادہ معانی اور مختصر تشریح بذریعہ درس و تدریس کو انہوں نے اولیں حیثیت دی۔ اسی تحریک نے ان کے صاحبزادوں کو

تفاسیر و تراجم قرآن لکھنے اور تسہیل قرآن پر آمادہ کیا، جس کی مناسب تشریح ہم تاریخ تفسیر کے آخری باب میں کر چکے ہیں۔

شاہ ولی اللہؒ کی وفات ۶۳ سال کی عمر میں ۱۱۷۶ھ میں واقع ہوئی۔ زندگی میں وہ اتنا کام کر چکے تھے کہ ان کے بعد ان کے خاندان اور شاگردوں نے ان کی علمی و اصلاحی تحریک کو سنبھال لیا اور یکے بعد دیگرے مسندِ علم وارشاد اور تبلیغ و جہاد سے متحدہ ہند بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کی پائیدار خدمات سر انجام دیتے رہے آج پاکستان و ہند میں جتنی علمی روشنی نظر آتی ہے اس کا اصل منبع شاہ ولی اللہؒ کی ذاتِ والاصفات ہے۔

الفوز الکبیر فی اصول التفسیر کا تعارف

اصول تفسیر کے علم پر اس شان کا مختصر رسالہ شاہ ولی اللہؒ سے پہلے کسی عالم نے نہیں لکھا، علامہ جلال الدین سیوطیؒ اور کئی دوسرے بزرگوں نے علوم القرآن پر کتابیں لکھیں مگر جو حسنِ ترتیب، جو وضاحتِ مطالب، جو علمی نکات اس ایک مختصر رسالے میں یکجا ملتے ہیں، کہیں اور نہیں ملتے۔ یہ رسالہ اپنے جلیل القدر مصنف کی علمی بصیرت مفسرانہ قابلیت، وسعتِ مطالعہ، اجتہادی شان اور کتاب اللہ سے خصوصی تعلق کا آئینہ دار ہے۔ اصل رسالہ فارسی زبان میں ہے جس کے آخر میں فتح الخبیر کے نام سے ایک مختصر عربی رسالہ ملحق کر دیا گیا ہے۔ فتح الخبیر کو شاہ صاحب نے الفوز الکبیر کا باب پنجم قرار دیا ہے اور اس میں اسباب نزول، ربط آیات، تفسیری احادیث و آثار اور آیات کے مفردات و جمل کے معانی و مطالب ایک حسین انداز میں جمع کر دیئے ہیں۔

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ہر مفسرِ قرآن کو کم از کم یہ غرائب القرآن یاد ہونے چاہئیں۔

الفوز الکبیر کے پہلے باب میں قرآنِ پاک کے علوم پنجگانہ پر مختصر بحث کی گئی ہے جو یہ ہیں، علم احکام و مسائل، علم مخاصمہ، علم تذکیر بآلاء اللہ، علم تذکیر بایام اللہ اور موت و مابعد الموت۔

دوسرے باب میں یہ ابحاث آئی ہیں: قرآن کی زبان، اسلوب بیان، ناسخ و منسوخ قرآنی آیات کی ترکیبی ہیئت، ابدال، محذوفات، تعریضات، استعارہ و کنایہ اور مجاز عقلی وغیرہ۔

تیسرے باب میں قرآن کے اسلوب بدیع کی بحث ہے۔ عام نظم و نثر کی تاثیر اور

ایک فصیح و بلیغ کلام کی کشش کا سبب، فصیح و بلیغ کلام کی ساخت اور آیاتِ قرآن کے نظم و توازن کا باہمی فرق واضح کیا گیا ہے۔

چوتھے باب میں فن تفسیر، اختلافِ تفسیر کے اسباب، استنباطِ احکام، اعجاز قرآن اور قرآن پاک کے نوادر و غرائب کی بحث ہے۔

علم اصولِ تفسیر کی تعریف

اصول تفسیر وہ علم ہے جس میں قرآن کے معانی و مطالب کی تشریح کے طریقوں سے بحث کی جاتی ہے۔ علامہ ابن تیمیہؒ (ف ۷۲۸ھ) نے اپنے رسالہ اصول تفسیر میں فرمایا ہے کہ

قرآن کی تفسیر سب سے پہلے خود قرآن سے کی جائے گی

کیونکہ قرآن اپنی تفسیر خود بھی بیان کرتا ہے۔ پھر سنت کی طرف رجوع ضروری ہے کیونکہ وہ قرآن کی شرح و وضاحت کرتی ہے۔ اگر کتاب و سنت سے تفسیر نہ ملے تو اقوال و آثار صحابہؓ کی طرف رجوع ضروری ہے کیونکہ وہ صاحبِ قرآن کے پہلے شاگرد تھے۔ اگر ان سے بھی تفسیر حل نہ ہو تو اقوالِ تابعین کی طرف رجوع کیا جائے گا کیونکہ کتاب و سنت کا علم صحابہؓ کی معرفت انہی کو براہِ راست ملا تھا۔ لیکن ان کے بعد علم قرآن کا دروازہ بند نہیں ہوا، بلکہ اللہ تعالیٰ کچھ لوگوں کو تفسیر کا خاص ملکہ بھی عطا فرماتا ہے۔ ہاں خواہشاتِ نفسانی سے تفسیر کرنا تفسیر بالرائے ہے جو حرام ہے۔

قرآن کریم کے علوم پنجگانہ

علم الاذکار

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کے مضامین ان پانچ علوم پر مشتمل ہیں:

۱۔ علم الاحکام: جس کی شرح و تفصیل اہلِ فقہ نے کی ہے، یعنی عبادات و معاملات، معاشرت و تمدن اور سیاست کے متعلق ان امور کا بیان: واجب، مستحب، مباح، مکروہ اور حرام۔

۲۔ علم مخاصمہ: جس کی تفصیل متکلمین نے کی ہے، یعنی مشرکین، یہود و نصاریٰ اور منافقین کے چار گمراہ طبقات کے ساتھ قرآن پاک کا بحث و مباحثہ اور ان کی ضلالت کا بیان۔

۳۔ علم تذکیر بآلاء اللہ: جس کا بیان و تشریح علماء راسخین و مشائخ کا وظیفہ ہے، یعنی خداوند تعالیٰ کی نعمتوں مثلاً کائنات کی پیدائش، بندوں کو ضروریاتِ زندگی مہیا کرنا اور اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کاملہ کا بیان۔

۴۔ علم تذکیر بایام اللہ : اس کا تعلق واعظ و ناصح سے ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار بندوں کی فوز و فلاح اور نیک جزاء اور مجرمین کے انجام و سزا کا بیان تاکہ اس سے عبرت حاصل ہو۔

۵۔ علم تذکیر بالموت و مابعد الموت : اس میں موت اور اس کے بعد پیش آنے والے واقعات مثلاً حشر و نشر، حساب و کتاب، میزانِ اعمال اور جنت و دوزخ کا بیان ہوتا ہے۔ اس سے عبرت و نصیحت کا سامان پیدا کرنا بھی مبلغ و واعظ کا وظیفہ ہے۔

علوم پنجگانہ میں قرآن کا اسلوب بیان

ان پانچوں علوم کے بیان میں قرآنِ کریم نے جو اسلوب بیان اور طرز ادا مدنظر رکھا ہے وہ شاہ صاحبؒ کے نزدیک مختصراً یہ ہے :

۱۔ علم الاحکام : حضورؐ کی بعثت ملتِ ابراہیمیہ پر ہوئی ہے لہٰذا اس کے اصول و قواعد قائم رکھے گئے، صرف تعلیم، فرائض اور حدود و تعزیرات میں اضافہ کیا گیا۔ عرب چونکہ اسلام کے اولین مخاطب تھے اور انہیں ساری دنیا میں اسلام کو علمی و عملی اعتبار سے پیش کرنا تھا، لہٰذا پہلے انہی کا تزکیہ کیا گیا۔ اس سلسلے میں شریعت کا مواد عربوں کے رسوم و عادات سے لیا گیا۔ ہر حکم میں حکمت اور سبب کو مدنظر رکھا گیا۔ ملتِ ابراہیمی کی بنیادی عبادتوں، طہارت کے احکام، نماز، روزہ اور حج میں جو تحریف کر دی گئی تھی اسے درست کیا گیا۔ اقامت صلوٰۃ کا بار بار حکم دیا گیا۔ طہارت، اذان، جماعت، مسجد اوقاتِ نماز کی تفصیل بیان کی گئی۔ مسائل زکوٰۃ کا ذکر قرآن نے مختصراً کیا اور سنت نے اس کی تفصیل و تشریح کی۔ روزے کا بیان البقرہ میں، حج کا البقرہ و الحج میں؛ جہاد و قتال کا البقرہ، آل عمران، نساء، انفال اور توبہ میں کیا گیا۔ حدود کا بیان المائدہ اور النور میں، میراث کا النساء میں اور نکاح و طلاق کا سورہ البقرہ، النساء اور طلاق وغیرہ میں کیا گیا خاندانی زندگی کے احکام بہت سی مدنی سورتوں میں دیئے گئے اور معاشرت سے ظلم و ستم اور غلط رسم و رواج کو نکال دیا گیا۔ نظام تمدن و سیاست کے بگاڑ کو دور کیا گیا اور کبائر و صغائر کی حد بندی ہوئی۔ ان احکام کو بعض دفعہ تو ابتداءً اتارا گیا اور بعض یہ کسی سوال کے جواب میں یا پیش آمدہ واقعہ کے حل میں نازل کئے گئے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ مومنین و منافقین کے کردار کو مقابلۃً پیش کر کے فضائل پر ابھارا گیا اور رذائل سے نفرت دلائی گئی۔ چنانچہ زجر و تنبیہ، طنز و اشارے اور استعارات کی زبان بھی استعمال

کی گئی۔

ب ۔ علم مخاصمہ : قرآن نے چار گمراہ جماعتوں ـــ مشرکین، یہود، نصاریٰ اور منافقین ـــ سے دو طرح کا مباحثہ کیا ہے : ایک یہ کہ ان کے باطل عقائد و اعمال کو بیان کر کے ان کے خلاف نفرت پیدا کی گئی ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کے شکوک و شبہات اور اعتراضات کو بیان کر کے ان کا رد کیا گیا ہے۔

۱۔ مشرکین اپنے آپ کو حنیف کہتے تھے، یعنی ملت ابراہیمی کے پابند اور اس کے شعائر کو ادا کرنے والے۔ ملتِ ابراہیمی کے شعائر یہ ہیں : حج، نماز میں کعبہ کو قبلہ بنانا، ختنہ، غسلِ جنابت، فطرت کے تمام خصائل مثلاً مسواک، مونچھیں کٹوانا اور ڈاڑھی بڑھانا، ناخن اتروانا، موئے بغل و موئے زیر ناف کو صاف کرنا، با حرمت مہینوں کا احترام، تعظیم کعبہ، نسبتی و رضاعی محرمات کو حرام جاننا، حلال جانوروں کو حلق سے ذبح کرنا اور اونٹ کو نحر کرنا اور ذبح و نحر جب زمانۂ حج میں ہو تو اس قربانی سے رضائے الٰہی کی طلب کرنا۔ اور ملت ابراہیمی کے شرعی اعمال یہ ہیں : وضو، نماز، روزہ، صدقہ، مساکین و یتامیٰ کی مدد، صلۂ رحمی، مشرکین نے ملتِ ابراہیمی کے ان شعائر کو ترک کر دیا تھا، گو انہیں قابلِ تعریف جانتے تھے۔ ان کی بجائے ان میں شرک، قتل، زنا، غصب اور رہزنی کا عام رواج تھا۔ ملت ابراہیمی کا بڑا اصول توحید تھا جس کا ذکر ان کے اشعار میں ذات و صفاتِ الٰہی کے سلسلے میں آتا ہے، لیکن اکثر لوگ شکوک و شبہات، بُت پرستی، آبا پرستی، کواکب پرستی، تحریف و تشبیہ، تعطیل و تجسیم کے قائل ہو گئے تھے۔ وہ آخرت کے منکر اور رسالت کو بعید از عقل جانتے تھے۔ انہوں نے اللہ کی مخصوص صفات یعنی علمِ ذاتی، قدرتِ محیط، روزی و شفا دینے میں اپنے خود ساختہ معبودوں کو خدا کا شریک بنا لیا تھا۔ گو جواہر کائنات کی خلق میں وہ اللہ کو واحد مانتے تھے لیکن چھوٹی چیزوں میں شرک کا ارتکاب کرتے تھے۔ وہ خدا کو دنیا دار بادشاہوں پہ قیاس کر کے اس کی قدرت اور خدائی میں اوروں کو شریک و دخیل جانتے تھے۔ چنانچہ غیر اللہ کو دعا میں پکارنا، غیر اللہ کو خوش کرنے کے لیے نذر و نیاز اور قربانی کرنا خدا کا تقرب حاصل کرنے کے لیے غیر اللہ کی رضا و تقرب کو ضروری جاننا ان کا شرک تھا۔ پہلے انہوں نے بزرگوں کی عزت و تعظیم کی، پھر ان کے نشانات بنائے اور آخر میں دھات اور پتھر کے بت بنا کر بزرگوں کی طرف منسوب کر دیئے اور انہیں مراسمِ عبادت میں واسطۂ خداوندی بنا کر پوجنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس کا شدید رد کیا اور

مشرکین سے مخاصمہ کرتے ہوئے ملتِ ابراہیمی کے شعائر سے استدلال کیا۔ شرک پر دلیل مانگی اور اندھی تقلید سے نفرت دلائی۔ بندوں کی بندگی و بے چارگی ثابت کی اور کہا کہ قربِ الٰہی سے کوئی بھی خدا یا اس کے برابر نہیں ہو جاتا۔ تمام انبیاء کے متعلق بتایا کہ وہ توحید کو قائم کرنے اور شرک کے ردّ کے لیے آئے تھے۔ بت پرستی کی برائی بیان کی۔ اور اس حرکت کو جاہلانہ، بے مقصد اور خلافِ عقل ٹھہرایا۔

مشرکین کا ایک شرک یہ تھا کہ وہ خدا کو دوسروں جیسا یا دوسروں کو اس جیسا قرار دیتے تھے، اسے تشبیہ کہتے ہیں۔ وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں ٹھہراتے۔ اسے دنیوی بادشاہوں کی مانند قرار دے کر مقربین کو اس کی حکومت و سلطنت اور مرضی و ناراضی میں دخل انداز جانتے تھے۔ انہوں نے بندوں کے علم اور سمع و بصر کو خدا پر اور خدا کی صفات کو بندوں پر قیاس کر لیا تھا۔ قرآن نے ان سے مخاصمہ کرتے ہوئے تشبیہ پر دلیل مانگی اور اندھی تقلید کا رد کیا اور کہا کہ باپ بیٹا ہم جنس ہوتے ہیں، جنہیں تم خدا کی اولاد کہتے ہو وہ خدا کی جنس سے نہیں۔ انہیں یہ بھی بتایا کہ تم خود تو لڑکی کو پسند نہیں کرتے اور اس کی پیدائش پر مارے شرم کے عرق عرق ہو کر چھپتے پھرتے ہو پھر خدا کے لیے بیٹیاں کیونکر تجویز کرتے ہو۔

مشرکین ملتِ ابراہیمی پر قائم ہونے کا دعویٰ رکھنے کے لیے باوجود اس سے منحرف ہو چکے تھے اور اس میں اپنی مرضی سے تحریف و تبدیلی کر لی تھی۔ عمرو بن لحُی نے ان میں بت پرستی کو رائج کر دیا تھا۔ وہ بحیرہ، سائبہ، حامی، قرعہ اندازی کے تیروں کے ذریعہ سے جوا کھیلنا اور اسے بتوں سے منسوب کرنا، آباء و اجداد کی غلط رسموں کی اندھی پیروی کے قائل تھے۔ پیغمبروں کی بزرگی کے قائل تھے مگر ان کی رسالت و نبوت ان کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ چنانچہ بشریت کو نبوت کے منافی جان کر رسولوں کا انکار کرتے تھے۔ اس تحریف کے جواب میں قرآن نے کہا کہ یہ انبیاء اور مذہبی بزرگوں سے ثابت نہیں اور جن لوگوں نے اسے ایجاد کیا تھا وہ گمراہ تھے۔ حشر و نشر کو خلافِ عقل جاننا خود بے عقلی کی بات ہے۔ انسان کی پیدائش، کائنات کی تخلیق، پانی سے سبزی ترکاری کا اگنا اس کی صاف دلیل ہے۔ فرمایا کہ پیغمبری و رسالت محال نہیں اور نہ بعید از عقل ہے۔ شروع سے پیغمبر ہوتے آئے ہیں جو سب مرد اور انسان تھے۔ رسول ہوتا تو بشر ہی ہے مگر اس پر خدا کی وحی آتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے ہم کلام ہوتا ہے۔

مشرکین پیغمبرؐ سے منہ مانگے معجزے طلب کرتے تھے، اس کے جواب میں فرمایا گیا

کہ تمہارا ہر مطالبہ مان لینا خلافِ مصلحت ہے اور کیا پتہ کہ معجزہ دیکھ کر بھی تم ایمان لاؤ یا نہ لاؤ؟ نبی تمہاری مرضی سے نہیں بلکہ خدا کی مصلحت و انتخاب سے مبعوث ہوتا ہے۔ اگر فرشتے کو نبی بنا کر بھیجا جاتا تو لوگ اس پر بھی اعتراض کرتے اور فرشتہ اپنی خاص صفات کی وجہ سے انسانی رہنمائی سے قاصر رہتا۔

۲۔ یہود سے قرآنی مخاصمے کا یہ انداز تھا کہ: یہودی ایک گری ہوئی قوم تھے۔ آسمانی کتابوں میں لفظی و معنوی تحریف کرتے تھے۔ ان کے علماء و مشائخ دین سے دور جا پڑے تھے، عوام کی عقیدت سے ناجائز مادی فوائد حاصل کرتے تھے، رشوت لیتے تھے، غلط فتووں پر اُجرت لیتے تھے۔ اپنی قوم کو نجات یافتہ اور باقی سب لوگوں کو جہنمی کہتے تھے۔ نبوت و رسالت کو صرف اپنی نسل سے مخصوص جانتے تھے۔ ایک نبی آخر الزماں کا ذکر ان کی کتابوں میں موجود تھا، حضورؐ کی آمد سے پہلے وہ آخری پیغمبر کے منتظر تھے اور اس کے جلد آنے کی دعائیں کرتے تھے۔ حضورؐ جب بنی اسمٰعیل سے آئے تو یہ لوگ مقابلہ میں اٹھ کھڑے ہوئے اور آپ کا انکار کر کے تورات اور دوسری مذہبی کتابوں کی گواہی کو چھپا لیا۔ ان میں شفاعت کا یہ غلط معنی رائج تھا کہ ہم خواہ کچھ بھی کریں۔ بہرصورت پیغمبر ہمیں نجات دلوادیں گے وہ یہودی شریعت و کتاب کو دائمی اور ناقابلِ نسخ مانتے تھے حالانکہ تاریخ کی پختہ شہادتوں سے تورات کا ضائع ہونا اور اس کی اصل کا گم ہونا ثابت ہو چکا تھا۔ وہ اپنے آپ کو خدا کے پیارے اور بیٹے کہتے تھے اور جنت کے وارث کہلاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے عقلی و نقلی دلائل سے اور خود ان کی تاریخ سے ان کے دعووں کا غلط ہونا سورۃ البقرہ وغیرہ میں ثابت فرمایا۔ اور ان کی تحریف، نسلی غرور، نجات یافتہ ہونے کے زعم باطل اور آباء و اجداد پرستی کا طلسم توڑ دیا۔ انہوں نے حضورؐ کے نام اور صفات کو چھپا لیا تھا جسے قرآن نے ظاہر کر دیا۔ جرائم کی تعزیرات جو تورات میں لکھی تھیں ان کے ہاں موقوف ہو گئی تھیں جس پہ قرآن نے انہیں ملزم و مجرم ٹھہرایا۔ ان کی نسل پرستی اور بنی اسمٰعیل کے ساتھ بغض و کینہ کو ظاہر کیا۔ وہ خود فتوے دے کر خدا تعالیٰ پہ بہتان لگاتے کہ شریعت کا یہی فیصلہ ہے۔ اس پہ انہیں سخت سرزنش کی گئی۔ سورہ البقرہ میں اس کی تفصیلات موجود ہیں، ان میں بخل و لالچ، نفس پرستی اور مادیت کا عشق پیدا ہو چکا تھا، قرآن نے انہیں ایک ایک خرابی پر ٹوکا۔ حضورؐ کی نبوت کو انہوں نے بعض حیلوں بہانوں سے بعید از عقل ٹھہرایا، مثلاً آپ کا بنی اسمٰعیل سے ہونا۔ اس پہ انہیں عقل و نقل دونوں سے الزام دے کر آپؐ کی نبوت کو ثابت کیا گیا۔

اس بحث کے آخر میں شاہ صاحبؒ نے علمائے سُوء کو تحریف و انحراف اور تقلید جامد و تاویلِ فاسد کے چکر میں مبتلا ہونے کے باعث یہود کا نمونہ قرار دیا ہے۔

۳۔ نصاریٰ سے مخاصمہ یوں واقع ہوا کہ وہ توحید کی راہ چھوڑ کر تثلیث و ابنیت مسیح اور کفارہ کے قائل ہو گئے۔ یہ راستہ مسیح ابن مریمؑ کے یکسر خلاف تھا۔ چنانچہ نقلی و عقلی دلائل سے مسیح کی بشریت و عجز، نبوت و رسالت، ان کی ماں کا پاکباز عورت ہونا، فرشتوں کا خدا کے عاجز و فرمانبردار بندے ہونا ثابت کیا گیا۔ مسیح کی بے باپ کی پیدائش کو جو ابنیت و معبودیت کی دلیل بنایا گیا تھا اس کا عقلی رد کیا گیا۔ بتایا گیا کہ آدم تو ماں باپ دونوں کے بغیر وجود پذیر ہوئے تھے، اگر تمہاری دلیل درست ہے تو آدمؑ کو کیا کہو گے؟ انہوں نے انجیل میں تحریف کی تھی اور بعض محاوراتی الفاظ کی آڑ لے کر عیسیٰ کو خدا یا ابن اللہ ٹھہرایا تھا۔ اس پر انہیں بتایا گیا کہ یہ محض تمہارے وہم و خرافات ہیں۔

نصاریٰ کے خلاف کلام آلِ عمران وغیرہ میں کیا گیا ہے۔ بحث کے آخر میں شاہ صاحبؒ نے فرمایا ہے کہ نصاریٰ کی مثال ہمارے ہاں گدی نشین ہیں جو اولیاء و مشائخ کی اولاد ہیں اور انہوں نے اپنے آباء و اجداد کے متعلق نصاریٰ کی مانند بے شمار ضلالتیں ایجاد کر رکھی ہیں۔

نصاریٰ نے یہود سے قتل و صلب مسیح کا عقیدہ لے کر اسے ایک اور رنگ دے دیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ مسیحؑ ہمارے گناہوں کے لیے صلیب پر کفارہ ہو گیا ہے۔ قرآن نے اس کا واضح رد کیا اور بتایا کہ یہ سب تمہارے وہم و خرافات ہیں جن کی تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں۔ نصاریٰ نے فارقلیط (احمدؐ) کی انجیلی بشارت میں تحریف کر لی تھی جس پر قرآن نے انہیں سرزنش کی اور بتایا کہ فارقلیط یہی پیغمبر آخر الزماں ہیں۔

۴۔ منافقین کا گروہ نہایت خطرناک تھا، قرآن نے کھول کر ان کی صفات بیان کیں۔ ان کی دو بڑی قسمیں تھیں۔

۱۔ قلبی منافق جو اندر سے کافر اور باہر سے مسلمان تھے۔

۲۔ اخلاقی و عملی منافق جو ضعفِ ایمان، قوم پرستی، دنیا پرستی، بخل و حسد اور کینہ، رسالت کے متعلق شکوک و شبہات، حبِ دنیا اور حبِ قوم کے امراض میں مبتلا تھے۔ یہ لوگ سخت بزدل تھے اور کھل کر سامنے نہیں آتے تھے۔ اعتقادی

نفاق کا پتہ حضورؐ کے بعد نہیں چل سکتا کیونکہ وحی منقطع ہو چکی ہے۔ دوسرے منافق کو اس کی علامتوں سے پہچانا جا سکتا ہے۔ احادیث میں کذب بیانی، وعدہ خلافی، سب وشتم، شکم پرستی کو علاماتِ نفاق قرار دیا گیا ہے۔ آج کل کے امراء اور ان کے مصاحبین پر یہ علامات صادق آتی ہیں اور معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ کون سے اور کس قسم کے لوگ تھے جن کو قرآن نے منافق قرار دیا ہے۔

ج۔ علم تذکیر بآلاء اللہ کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں انسانی ذہن اور اس کے محدود علم و فہم کو مدنظر رکھا ہے۔ اسماء و صفاتِ الٰہیہ کو سہل اور سادہ انداز میں عوام کے محاورات کے ذریعے پیش کیا ہے تاکہ وہ انہیں سمجھ سکیں اور فلسفہ و علم الٰہیات کے محتاج نہ رہیں۔ اللہ کی صفات کے متعلق قرآن نے بتایا کہ جس طرح اس کی ذات بے چون و چگون ہے اسی طرح اس کی صفات بھی بے مثل و بے نظیر ہیں۔ لیس کمثلہ شیئ وھو السمیع البصیر ۵ اس آیت نے بتا دیا کہ خدائی صفات کے مانند کسی کی صفات نہیں۔ اور دوسروں جیسی صفات اس میں نہیں۔ وہ ہر عیب و نقص اور کمزوری سے پاک ہے۔

خدا کی نعمتوں کے متعلق سادہ اور موٹی باتیں بیان کی گئیں مثلاً تخلیقِ کائنات بادل سے بارش برسانا، چشمے جاری کرنا، پانی سے پھل پھول اور سبزی ترکاری پیدا کرنا، سمندروں اور پہاڑوں جیسی عظیم نشانیوں کا پیدا کرنا، انسان کے مختلف احوال و کیفیات اور ان میں فطرت کی رہنمائی وغیرہ۔ جو شخص بھی گہری نظر سے ان چیزوں پر غور کرے وہ حقیقت تک پہنچ سکتا ہے۔

تذکیر بایام اللہ قرآن مجید نے گزشتہ نافرمان قوموں کے حالات عبرت کے لیے بیان کیے ہیں۔ ان واقعات کو لوگ پہلے سے سنتے آ رہے تھے لیکن قرآن نے ان کے عبرت و نصیحت کے پہلو کو اجاگر کیا۔ قصوں اور واقعات کو محض افسانہ گوئی کے رنگ میں بیان نہیں کیا بلکہ ان کے اسباب و نتائج پر تدبر کی دعوت دی۔ قومِ نوحؑ، قومِ عاد، قومِ ثمود، قومِ شعیبؑ، قومِ صالحؑ، قومِ لوطؑ پر عذاب کے نزول کی داستانیں بیان کی گئیں۔ حضرت ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحٰق، موسیٰؑ و ہارونؑ، داؤد و سلیمانؑ، زکریا و یحییٰؑ، عیسیٰ ابن مریمؑ اور ان کی والدہ ماجدہ کے قصے قرآن میں کئی دفعہ بیان کئے ہیں۔ آدم علیہ

السلام کی پیدائش سے دخولِ جنت اور پھر وہاں سے دنیا میں آنے کے واقعات کا ذکر قرآن پاک میں بہت دفعہ آیا ہے۔ حضرت ادریسؑ کے رفع کا واقعہ، ابراہیم کا نمرود سے مباحثہ، پرندوں کو زندہ ہوتے دیکھنا، ذبح اسمٰعیلؑ، ولادتِ موسیٰؑ اور ان کی طویل سرگزشت، موسیٰ و خضر کی ملاقات، قصۂ یوسفؑ، طالوت، بلقیس، ذوالقرنین اور اصحابِ کہف کے قصے ایک دو بار ہی بیان ہوئے ہیں۔

انبیاء کے واقعات کے ذکر سے حضورؐ اور صحابہؓ کی تسلی اور کفار کے لیے عبرت کا سامان مہیا کرنا مطلوب ہے۔ مُعذّب قوموں کے واقعات سے تمام عبرت دلانا مدِنظر ہے۔ علاوہ ازیں توحید و توکّل، صبر و ثبات، جہاد و قتال میں ثابت قدمی، راہِ حق کے مصائب میں مومن کا کردار واضح کرنا بھی پیش نظر ہے۔ تاکہ خدا کی نصرت و حمایت کا یقین پختہ ہو، اعتماد علی اللہ میں ترقی ہو اور نیکی کے لیے کام کرنے کا جذبہ پختہ تر ہو جائے۔

تذکیر بالموت و مابعد الموت

اس میں موت کا برحق ہونا، اس کی کیفیات، عالمِ نزع کی حالت انسان کی موت کے آگے برزخ درماندگی اور علاماتِ قیامت کا بیان ہوتا ہے۔ قیامت کی علامات میں سے نزولِ عیسیٰؑ، دابۃ الارض کا خروج، یاجوج ماجوج کا خروج مذکور ہے۔ قیامت کی قریبی علامات میں سے نفخِ صُور، زمین و آسمان اور مظاہرِ قدرت کی تباہی کا ہولناک بیان ہے۔ قیامت کے واقعات میں سے حشر و نشر کا صُور سوال و جواب، حساب و کتاب، میزانِ اعمال، اعمال ناموں کا دیا جانا، اہلِ جنت و دوزخ کا اپنے اپنے مقام میں داخلہ، ان کا سوال و جواب، اعراف والوں کا ذکر، اہلِ جنت کی باہمی بات چیت، دوزخیوں کی بحث و تکرار، دیدارِ خداوندی، جنت کی نعمتوں اور عذابِ جہنم کے مختلف انواع کا بیان، جنتیوں کا رضوان سے اور جہنمیوں کا مالک سے کلام وغیرہ مذکور ہے۔ یہ مضامین قرآن کی بہت سی سورتوں میں ــــ بالخصوص مکی سورتوں میں ــــ جابجا بکھرے ہوئے ہیں۔

ان علومِ پنجگانہ کے علاوہ قرآن نے حضورؐ کی سیرت و اخلاق اور آپؐ کی زندگی میں پیش آنے والے بہت سے واقعات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ مثلاً جنگ بدر کے واقعات، جنگِ اُحد، جنگِ خندق، صلح حدیبیہ، مکہ کی فتح، جنگِ حنین، غزوۂ بنی نضیر، جنگ تبوک اور اس کے متعلقات، حجۃ الوداع، نکاحِ زینبؓ کا قصہ،

حضورؐ کے اپنے اوپر شہد کو حرام ٹھہرانے کا واقعہ، واقعہ افک، واقعۂ ہجرت اور غار ثور کا قصہ، جن کے قرآن سننے کا ذکر، مسجدِ ضرار اور واقعۂ معراج وغیرہ۔ ان واقعات سے بہت سے احکام اور عبرتیں مستنبط ہوتی ہیں اور حضورؐ کی زندگی اور اسلامی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔

نظمِ قرآن کے معانی میں خفاء کے اسباب

قرآن کا نزول محاورۂ عرب کے مطابق ہوا ہے، لہٰذا عربوں نے اس کے معانی فوراً سمجھ لیے۔ جہاں ضرورت پیش آئی، حضورؐ نے وضاحت فرما دی۔ مثلاً قرآن کی خاص اصطلاحات۔۔۔ صلوٰۃ، صوم، اہلال، نذر، زکوٰۃ، حج وغیرہ۔۔۔ کی توضیح و تشریح حدیث و سنت سے ہوئی۔ قرآن کو واضح عربی زبان (عربی مبین) میں اتارا گیا تاکہ وہ لوگ جو اس کے اوّلیں مخاطب تھے، اس کے معانی و مطالب کو سمجھ جائیں۔ قرآن نے خود اپنے اجمال کی تفصیل بھی بیان کی ہے۔ متشابہ آیات میں غور و خوض شارع کی مرضی کے خلاف تھا اور بقدرِ ضرورت لوگ اہلِ زبان ہونے کی وجہ سے خود سمجھ جاتے تھے مبہم امور کی بلا وجہ تفصیل اور قصوں کی کھود کرید کو خلافِ منشاءِ الٰہی جان کر صحابہؓ ان کے متعلق بالعموم سوال نہ پوچھتے تھے۔ لیکن دورِ اوّل کے بعد جب عجمی لوگ اسلام میں بکثرت داخل ہو گئے، سیاسی و مذہبی مناظرے شروع ہو گئے، پہلی خالص عربی زبان سے شغف کم ہو گیا اور وہ تقریباً متروک ہو گئی تو تفہیمِ قرآن کے لیے لغت، صرف و نحو، بلاغت و معانی، عروض و قوافی وغیرہ کی ضرورت پڑی۔ پھر تفسیر وجود میں آئی اور فقہ، کلام و عقائد، علومِ حدیث، اصول اور دوسرے علوم کی کتابیں مرتب ہوئیں۔

معانیٔ الفاظ کے مخفی ہونے کے اسباب

ایک سبب کسی لفظ کا غریب، اجنبی اور غیر مانوس ہونا ہے۔ ایسے لفظ کا معنی صحابہ و تابعین اور علمِ معانی والوں سے دریافت کرنا چاہیے۔ دوسرا سبب ناسخ و منسوخ کا علم نہ ہونا ہے، اس کا علاج یہ ہے کہ اربابِ تفسیر و احکام سے اس کی حقیقت معلوم کی جائے۔ تیسرا سبب یہ ہے کہ بعض دفعہ کسی آیت یا سورت کا شانِ نزول معلوم نہیں ہوتا، اسے معلوم کرنا چاہیے۔ چوتھا سبب حذف ہے، یعنی مضاف یا موصوف وغیرہ کا محذوف ہونا، پس اسے معلوم کرنا لازم ہے۔ پانچواں سبب ابدال ہے۔ یعنی بعض دفعہ ایک چیز کی بجائے دوسری

ایک حرف کی بجائے دوسرا، ایک اسم کی جگہ دوسرا، ایک فعل کی جگہ دوسرا، واحد کی بجائے جمع یا برعکس، غائب کی ضمیر کی بجائے مخاطب کی ضمیر کا لانا بھی معانی میں پوشیدگی کا باعث ہوتا ہے۔ اس کا حل ارباب لغت ونحو کا کام ہے۔ اسی طرح کبھی ایک ہی بیان میں ضمیریں منتشر ہوتی ہیں، یا فقط لفظ کے کئی معانی ہوتے ہیں جس سے خفاء پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن مضمون سے تکرار یا طول سے کبھی اجمال واختصار سے اور بعض دفعہ استعارہ یا کنایہ یا مجاز عقلی کے سبب کلام میں الجھن پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا حل ارباب معانی وبیان کے سپرد ہے۔

غیر معروف قرآنی الفاظ کی شرح

غریب القرآن کی بہترین شرح عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے کی ہے، جو ابن طلحہ ہاشمی رحمہ اللہ کی روایت سے شاہ ولی اللہ کو پہنچی اور امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی اس پر اعتماد کیا ہے۔ پھر ضحاک رحمہ اللہ کی روایت سے ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر ہے اور تیسرے نمبر پہ نافع بن الازرق خارجی کے سوالات کے جواب میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کی شرح وتفسیر ہے۔ ان تینوں کا ذکر اتقان میں سیوطی رحمہ اللہ نے کیا ہے۔

چوتھا درجہ امام بخاری رحمہ اللہ کی تفسیر کا ہے جو انہوں نے ائمہ تفسیر سے نقل کی ہے اس کے بعد وہ شرحیں ہیں جنہیں دوسرے مفسرین نے صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین اور تبع تابعین سے روایت کیا ہے۔ ان کا ایک معقول حصہ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے پانچویں باب میں غرائب القرآن کے نام سے درج کیا ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین الفاظ قرآن کی شرح اکثر لغت کے پیش نظر نہیں کرتے بلکہ لازم معنی کے طور پر کرتے ہیں۔ بعد کے مفسرین نے لغت کی مدد سے معانی کی تلاش کی اور بزرگان سلف کی تفسیر کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کتاب میں ہم نے شرح الفاظ کے لیے سلف کی پیروی کی ہے۔

ناسخ ومنسوخ

ناسخ ومنسوخ کی شناخت فن تفسیر میں نہایت اہم ہے اور یہ مسئلہ اس فن کے مشکل مقامات میں سے ہے۔ سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ نسخ کے معنی میں متقدمین اور متاخرین کی اصطلاحوں کا اختلاف ہے۔ اس لحاظ سے نسخ کے دو معنی ہیں:

ا۔ اس لفظ کا لغوی معنی، یعنی ایک چیز کو مٹا کر دوسری سے لے آنا۔ یہ معنی صحابہؓ و تابعین کے کلام میں عام استعمال ہوتا ہے۔ یہ معنی خاص ہے اور متاخرین میں یہی مشہور رہا ہے۔

ب اہل اصول کی اصطلاح میں نسخ کا لغوی معنی مراد نہیں ہوتا بلکہ ان کے نزدیک نسخ کا معنیٰ یہ ہے کہ ایک آیت کے بعض اوصاف کو دوسری آیت سے زائل کیا جائے۔ یہ معنی عام ہے اور اس میں بعض دفعہ پہلا معنی بھی داخل ہو جاتا ہے۔ پس اصطلاحی معنی میں نسخ کی یہ صورتیں ہوئیں:

۱۔ پہلی آیت کی مدتِ عمل کا ختم ہو جانا، یعنی اب عمل دوسری آیت پر ہے نہ کہ پہلی پر۔

۲۔ کلام کو ظاہری اور صاف معنی سے پھیر کر دوسرے معنی کی طرف لے جانا۔

۳۔ کسی آیت میں لگی ہوئی کسی قید کو اٹھا دینا، یا کسی آیت میں کسی قید کا بڑھا دینا۔

۴۔ عام کو خاص کر دینا۔

۵۔ کبھی کسی صریح آیت اور اس پر قیاس کیے ہوئے مسئلے میں فرق بتانے کے لیے بھی لفظ نسخ بولا گیا ہے۔

۶۔ زمانۂ جاہلیت کی کسی رسم و عادت کو مٹا دینا یا کسی پہلی شریعت کے حکم کو زائل کرنے کو بھی نسخ کہا جاتا ہے۔

نسخ کے اس اصطلاحی معنی کے لحاظ سے قرآن کی منسوخ آیات کی تعداد ۵۰۰ تک جا پہنچی لیکن غور کیا جائے تو یہ دائرہ بہت وسیع ہے اور تعداد اس سے بھی زیادہ ہے۔ اور تعدادِ منسوخات میں اختلاف کا باعث نسخ کے معنی میں اختلاف ہے اس امر کو ملحوظ نہ رکھنے سے بہت الجھنیں پڑتی ہیں۔ مگر متاخرین کی اصطلاح (نسخ کا لغوی معنی یعنی مٹانا اور زائل کر دینا) میں منسوخ آیات کی تعداد کم ہے، چنانچہ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے الاتقان میں نسخ پر کلام کرتے ہوئے ان کی تعداد متاخرین کے نزدیک بموافقت شیخ ابن عربیؒ تقریباً انیس ۱۹ لکھی ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ تعداد اس سے بھی کم یعنی صرف پانچ ہے۔

شاہ ولی اللہؒ کے نزدیک پانچ منسوخ آیات

اور ان میں سے صرف تین آیات ایسی ہیں جن کے متعلق شاہ ولی اللہؒ نے نسخ کو تسلیم کیا ہے۔ دو میں ایسی تاویل ممکن ہے کہ انہیں منسوخ نہ کہا جائے۔ پانچ کا عدد شاہ صاحبؒ نے اس لیے

لکھا ہے کہ دلائل کی رو سے ان پانچ کو نسخ کے لیے متعین کیا جا سکتا ہے، پھر بعد میں تو ان کا منسوخ ہونا بھی مسلّم نہ رہے۔ غرض وہ پانچ آیات یہ ہیں:

۱۔ تقسیم وراثت کا حکم آنے سے قبل مرنے والوں پر وصیت فرض تھی۔ چنانچہ البقرہ میں ہے، کُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ۔ پھر جب سورۂ نساء میں تقسیم وراثت کا حکم اترا: یوصیکم اللہ تو آیتِ وصیت منسوخ ہوگئی اور حدیث لا وصیۃ لوارث نے اس نسخ کو بیان کیا ہے۔ پس حدیث ناسخ نہیں نسخ کو ظاہر کرتی ہے اور ناسخ آیت یوصیکم اللہ ہی ہے۔ میں گزارش کرتا ہوں کہ اگر پہلی آیت (وصیت والی) کے لفظ کُتِبَ کا معنی فرضیت نہ لیا جائے بلکہ محض تعلیم و ارشاد مراد لیا جائے تو اسے بھی منسوخ ماننے کی حاجت نہیں رہتی گو اپنی جگہ شاہ صاحبؒ کا قول بالکل درست ہے۔

۲۔ سورہ انفال کی آیت ۶۵ میں فرمایا گیا کہ اپنے سے دس گنا کفار کا مقابلہ بہر حال مسلمانوں کو کرنا چاہیے: إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ الآیہ لیکن اگلی آیت میں ہے کہ مسلمانوں کے ضعف پر نظر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے تخفیف کر دی ہے اور اب اپنے سے دوگنے کفار کا مقابلہ بہر حال فرض ہے۔ (بشرطیکہ نفیر عام نہ ہو جائے ورنہ جہاد و قتال فرض عین ہوگا!) الآن خفف اللہ عنکم وعلم ان فیکم ضعفا الآیہ۔ پس دوسری آیت اس آیت کو منسوخ کرتی ہے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ ان آیتوں میں بھی ایمان کی قوت و ضعف کے مدارج کو ملحوظ رکھ کر کہا جائے کہ پہلا حکم ان کے لیے ہے تو نسخ کی حاجت نہیں رہتی، بعض فاضل مفسرین نے یہی کہا ہے۔ تفصیل ہماری تفسیر سورہ انفال میں ہے۔ لیکن شاہ صاحب کا قول بجائے خود بجا ہے۔

۳۔ سورہ مجادلہ میں حضورؐ سے مشورہ (خفیہ) کے متعلق منافقین کی سازشوں کا سدّباب کرنے کے لیے آیت میں صدقہ کا حکم دیا ہے إِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُولَ فَقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوَاكُمْ صَدَقَةً ...... فَإِنْ لَمْ تَجِدُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ یہ اپنے بعد والی آیت سے منسوخ ہے: فَإِذْ لَمْ تَفْعَلُوا وَتَابَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ۔ لیکن غور کیا جائے تو پہلی آیت میں بھی صدقہ کا حکم فرض نہ تھا جیسا کہ فَإِنْ لَمْ تَجِدُوا الخ سے واضح ہے، پس نسخ کا سوال نہ رہا کیونکہ حکم تو پہلے بھی مال داروں کے لیے تھا جو دوسری آیت سے بھی صراحۃً

منسوخ نہیں ہوا۔ بہر حال عام مفسرین نے یہاں نسخ پر طویل بحثیں کی ہیں۔ اور غالباً شاہ صاحبؒ نے انہی کی متابعت میں ان آیات کو ناسخ و منسوخ مانا ہے۔

یہ تین آیات تو وہ ہیں جن میں شاہ صاحبؒ نے نسخ کو تسلیم کیا ہے۔ دوسری دو آیات جن میں نسخ کو تسلیم کرتے ہوئے تاویل کر دی ہے وہ یہ ہیں:

۴۔ سورہ نساء کی آیت وَاللَّاتِي يَأْتِينَ الْفَاحِشَةَ مِن نِّسَائِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوا عَلَيْهِنَّ أَرْبَعَةً مِّنكُمْ فَإِن شَهِدُوا فَأَمْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ حَتَّىٰ يَتَوَفَّاهُنَّ الْمَوْتُ أَوْ يَجْعَلَ اللَّهُ لَهُنَّ سَبِيلًا ۝ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ سورۂ نور کی آیت الزانیۃ والزانی فاجلدوا کل واحد منہما مائۃ جلدۃ کے ساتھ منسوخ ہو گئی تھی۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ نسخ نہیں ہوا بلکہ سورۂ نساء کی آیت میں بدکار عورتوں کے لیے "کوئی راہ نکالنے" کا وعدہ تھا جو سورۂ نور کی آیت سے پورا ہو گیا ہے، اور ان کی سزا بیان کر دی گئی ہے۔

۵۔ سورۂ مائدہ کی آیت شہادۃ بینکم اذا حضر احدکم الموت حین الوصیۃ اثنان ذوا عدل منکم او آخران من غیرکم میں امام احمدؒ کے نزدیک من غیرکم سے غیر مسلم مراد ہیں (جیسا کہ ظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے)، لیکن دوسرے ائمہ کے نزدیک من غیرکم سے غیر اقارب مراد ہیں نہ کہ غیر مسلم۔ اور دوسری آیت میں ہے "و اشھدوا ذوی عدل منکم" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلم کا مسلمانوں پہ گواہ بنانا جائز نہیں۔ سو دیگر ائمہ کے نزدیک تو پہلی آیت میں نسخ کا سوال نہیں مگر امام احمدؒ کے بیان کردہ معنی کی بنا پر اسے منسوخ ماننا پڑے گا۔ خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ جمہور کے نزدیک یہاں بھی نسخ نہیں، مگر امام احمدؒ کا بیان کردہ معنیٰ چونکہ شاہ صاحبؒ کے نزدیک آیت کے الفاظ سے ظاہر و باہر اور متبادر ہے لہٰذا نسخ کا قول لازم ہوا۔

وہ غیر منسوخ آیات جنہیں منسوخ کہا گیا ہے

۱۔ سورۂ بقرہ کی آیت وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ کو دوسری آیت فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ کی وجہ سے منسوخ کہا گیا ہے دلیل یہ دی کہ پہلی آیت میں طاقت کے باوجود روزہ نہ رکھنے بلکہ فدیہ ادا کر دینے کی اجازت تھی جسے دوسری میں واپس لے لیا گیا اور ہر عاقل و بالغ مسلمان پر روزہ فرض کیا گیا۔ جو لوگ پہلی آیت کو منسوخ

مانتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس میں حرف کے قاعدہ ذکر کہ باب افعال کبھی سلب مادہ کے لیے بھی آتا ہے، سے لا چھپا ہوا ہے اور عبارت دراصل یوں ہے دَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَہ۔ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک طعام مسکین سے مراد صدقۂ فطر ہے۔ آیت کا معنی یہ ہے کہ "جن لوگوں پہ صدقۂ فطر کی استطاعت ہے وہ ان پر واجب ہے" پس عبارت یوں ہوئی: وعلی الذين يطيقونہ الطعام الخ اور اس کے بعد وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰكُمْ میں تکبیرات عید کا ذکر ہے اور ولعلكم تشكرون میں نماز عید کا بیان ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے يطيقونہ سے مراد يطوّقونہ مذکور ہے۔ یعنی جو لوگ نہایت مشکل سے روزہ رکھ سکتے ہیں مگر اسے پورا نہیں کر سکتے وہ روزہ کا فدیہ ادا کر دیں۔ پس آیت کے نسخ کا قول بہر حال درست نہیں ہے۔

۲۔ سورہ بقرہ کی آیت كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ میں روزہ جو ہم پہ فرض ہوا ہے اسے پہلی امتوں کے روزے سے تشبیہ دی گئی ہے، اور ان میں صیام کی راتوں کو بھی مباشرت حرام تھی، نیز جو شخص افطار صوم کے وقت سو جاتا وہ اٹھ کر کچھ کھا پی نہ سکتا تھا کیونکہ ان امتوں میں سحری کھانے کا حکم نہ تھا۔ پس آیت اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ سے پہلی آیت کو منسوخ کر دیا گیا اور اس امت سے یہ پابندیاں اٹھا دی گئیں۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ كما كتب کی فرضیت صرف فرضیت صوم کے لیے ہے نہ کہ اس کے باقی احکام کے لیے بھی۔ بات صرف اتنی تھی کہ لوگ پہلی امتوں کے عمل کو دیکھ کر سمجھ بیٹھے تھے کہ شاید تشبیہ کا منشا یہ ہے کہ وہ ہر لحاظ سے ہے اور روزہ کی رات کو وطی حرام ہے۔ ان کی اس غلط فہمی کو دور کر دیا گیا پس یہ نسخ نہیں ہے۔ یہ بھی ثابت نہیں کہ حضورؐ نے پہلے وطی کی حرمت بیان فرمائی تھی جسے بعد میں جائز قرار دیا گیا۔

۳۔ سورہ بقرہ کی آیت قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ۔ میں شہر حرام میں قتال کی حرمت بیان کی گئی ہے۔ پھر بقول ابن جریرؒ سورۂ توبہ کی آیت قَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً سے اسے منسوخ کر کے شہر حرام میں مشرکوں سے ہر وقت اور ہر حال میں جنگ کا حکم دیا گیا۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ پہلی آیت کے نسخ کا سوال تب ہے جب واقعی اس میں قتال کو حرام ٹھہرایا گیا ہو۔ مگر معاملہ برعکس ہے اور دراصل اس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ گو شہر حرام میں جنگ کرنا برا ہے مگر مشرک جن افعال کے مرتکب

ہیں وہ اس سے بھی بدتر ہیں لہٰذا ان کے کفر و شرک کا راستہ روکنے کے لیے جنگ جائز ہے۔ پس جب اس میں جنگ کی اجازت دیدی گئی تو نسخ کا سوال نہ رہا۔

۴۔ سورہ بقرہ میں مردوں کو موت کے وقت بیویوں کے حق میں ایک سال کا خرچ دینے اور گھر سے نہ نکالنے کی وصیت کا حکم دیا گیا ہے۔ وَصِيَّةً لِّأَزْوَاجِهِم مَّتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ ۔ یہ آیت بیوہ کی عدت والی آیت يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا سے منسوخ ہے۔ اب وصیت کا حکم نہیں رہا اور سال بھر ٹھہرانا حدیث لا سکنیٰ کی وجہ سے منسوخ ہوا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ابن عباسؓ کے نزدیک مرنے والے پر وصیت تو اب بھی مستحب ہے لیکن عورت پہ دوسری آیت کے سبب سال بھر تک خاوند کے گھر ٹھہرنا فرض نہیں بلکہ اسے اختیار ہے کہ رہے یا نہ رہے۔ اس معنی کی رُو سے نسخ کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

۵۔ البقرہ کے اواخر میں فرمایا ہے کہ إِن تُبْدُوا مَا فِي أَنفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ يُحَاسِبْكُم بِهِ اللَّهُ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دل کے خطرات و وساوس پر بھی محاسبہ اور گرفت ہوگی۔ لیکن پھر لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا میں پہلی آیت کو منسوخ کردیا ہے کیونکہ وساوس و خطرات نفس پر گرفت کرنا تکلیف مالا یطاق ہے شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہاں نسخ نہیں بلکہ پہلی آیت کے عموم کو خصوص میں بدلا گیا ہے۔ پس پہلی آیت کے لفظ ما فی انفسکم سے مراد دل کا خلوص یا نفاق ہے، کہ ان پر تو محاسبہ ہوگا مگر وساوس و خطرات چونکہ انسان کے بس میں نہیں لہٰذا وہ اس آیت کے عموم سے خارج ہیں بدلیل لا یکلف اللہ۔

۶۔ سورۂ آلِ عمران میں ارشاد ہے اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ اور ایک دوسری جگہ قرآن کہتا ہے فاتقوا اللہ ما استطعتم۔ سو پہلی آیت میں تو اس طرح خدا سے ڈرنے کا حکم ہے جیسا کہ اس کا حق ہے اور دوسری آیت میں تقویٰ کا حکم حسب استطاعت ہے۔ معلوم ہوا کہ پہلی آیت منسوخ ہے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ یہاں بھی کوئی نسخ نہیں بلکہ پہلی آیت میں شرک و کفر سے بچنے کا حکم ہے اور دوسری میں اعمال و فرائض پر حسب استطاعت جمے رہنا مراد ہے اور پہلی آیت کا اگلا حصہ: وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ ۝ اسی معنی پر دلالت کرتا ہے کہ مرتے دم تک اسلام

لہ قاضی بیضاویؒ نے بھی یہی لکھا ہے۔

پر قائم رہو اور شرک و کفر سے نفور رہو۔

۷۔ سورۂ نساء کی آیت وَالَّذِينَ عَقَدَتْ أَيْمَانُكُمْ فَآتُوهُمْ نَصِيبَهُمْ اس آیت سے منسوخ ہے: وَأُولُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ کیونکہ پہلی آیت میں مواخات کے باعث قائم شدہ بھائی چارے کی بناء پر میراث دینے کا حکم ہے اور دوسری میں میراث کو رشتہ داروں کا حق قرار دیا گیا ہے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ یہاں بھی نسخ نہیں ہے۔ دوسری آیت کی رو سے وراثت کو رشتہ داروں کا حق قرار دیا گیا مگر پہلی آیت کی رُو سے عقدِ مواخات والوں سے نیکی کرنے کا حکم دیا گیا۔ اور دونوں میں کوئی منافات نہیں ہے۔

۸۔ سورۂ نساء میں ہے: وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُو الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُمْ مِنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَعْرُوفًا۔ تقسیم میراث کے وقت جو مستحق آجائیں انہیں بھی کچھ دے دیا جائے۔ اس آیت کو بعض نے محکم اور بعض نے اس کے حکم کو مستحب ٹھہرایا ہے۔ شاہ صاحبؒ تیسرے مسلک کے قائل ہیں جو ابن عباسؓ سے ثابت ہے، یعنی اس کا حکم استحبابی ہے وجوبی نہیں۔ منسوخ کہنے والوں کی دلیل آیتِ میراث ہے: یوصیکم اللہ الخ عام مفسرین اسی کو ترجیح دیتے ہیں کہ ابن عباسؓ کا قول صحیح ہے۔ اس سے نسخ والا قول لازم نہ ٹھہرا۔

۹۔ سورۂ مائدہ کی آیت لَا تُحِلُّوا شَعَائِرَ اللَّهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ کو منسوخ کیا گیا ہے اور کہا حرمت مہینوں میں قتال کو بعد میں جائز کر دیا گیا تھا بدلیل آیت قاتلوا المشرکین کافۃ۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ جب مشرک پہل کریں تو دفاع و قتال ہر وقت جائز ہے، لیکن باحرمت مہینے میں ابتداءً قتال کو مسلمانوں پر حرام کر دیا گیا ہے۔ پس پہلی آیت میں دوسری اور دوسری میں پہلی کا ذکر ہے اور یہی مضمون کتاب و سنت کے دوسرے بے شمار دلائل سے ثابت ہے۔ پس نسخ کا کوئی سوال نہیں۔ خلاصہ یہ ہوا کہ جو قتال جائز ہے وہ ہر وقت جائز ہے۔

۱۰۔ سورۂ نساء میں ہے کہ فَإِنْ جَاءُوكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ أَوْ أَعْرِضْ عَنْهُمْ اس آیت میں حضور کو غیر مسلموں کے مقدمات میں فیصلہ کرنے یا نہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ لیکن دوسری آیت میں ہے کہ وان احکم بینهم بما انزل اللہ اس میں آپ کو غیر مسلموں میں فیصلہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پس پہلی آیت منسوخ اور دوسری ناسخ ہے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ یہاں بھی نسخ نہیں ہوا بلکہ پہلی آیت میں اختیار اور دوسری میں اس کی مزید

وضاحت ہے۔ یعنی اگر آپ فیصلہ کریں تو بموجب حکم خداوندی کریں نہ کہ کسی کی خواہشات کے مطابق۔ پس نسخ نہ رہا۔

۱۱۔ سورۂ توبہ میں حکم ہے اِنۡفِرُوۡا خِفَافًا وَّثِقَالًا ۔ یعنی ہر حال میں جہاد کے لیے باہر نکل پڑو۔ لیکن آگے چل کر آیت لیس علی الاعمیٰ حرج اور لیس علی الضعفاء سے معذور لوگوں کو حکم جہاد سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ پس پہلی آیت منسوخ ہوئی۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ معذور لوگ خفاف وثقال کے حکم میں پہلے ہی داخل نہ تھے کیونکہ خفافا کا معنی ہے تھوڑا اسامانِ جنگ، اسلحہ اور سامانِ خورد و نوش لے کر نکلنے والے اور ثقالاً سے مراد ہے بہت زیادہ سامان لے کر جانے والے۔ اور ظاہر ہے کہ معذور دونوں صورتوں میں اس کے حکم کے اندر داخل ہی نہیں۔ ہاں! کچھ لوگوں نے چونکہ یہ سمجھا تھا کہ پہلی آیت کی رُو سے معذوروں پر بھی جہاد فرض ہے۔ لہٰذا انہیں صراحتہً اس حکم سے خارج کر دیا گیا۔

۱۲۔ سورۂ نور میں ہے اَلزَّانِیۡ لَا یَنۡکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً الخ امام احمدؒ کے نزدیک اس کا معنی یہ ہے کہ زانی مرد کا نکاح صرف زانی عورت سے کیا جائے گا اور حُرِّمَ ذٰلِکَ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ؁ سے مراد ان کے ہاں غیر زانی لوگوں کے لیے زانی عورت سے نکاح کی حرمت کا بیان ہے، ذٰلِکَ کا اشارہ گویا نکاح کی طرف ہے۔ امام احمدؒ کے اس معنی کی رُو سے قرآن کی دوسری آیت و انکحوا الایامیٰ منکم نے اسے منسوخ کر دیا ہے۔ کیونکہ اس آیت سے مطلقاً بے مرد یا بے عورت لوگوں کے نکاح کا حکم دیا گیا ہے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ دیگر ائمہ کے نزدیک سورۂ نور کی آیت کا معنی یہ ہے کہ زانی مرد اور زانیہ عورت باہم کفو ہیں۔ گویا حکم بیان نہیں ہو رہا بلکہ ایک حقیقتِ موجودہ کا اظہار ہے اور ذٰلِکَ کا اشارہ فعلِ زنا کی طرف ہے کہ وہ ایمانداروں پہ حرام ہے اس معنی کی رُو سے اس آیت کے نسخ کا سوال خارج از بحث ہوا۔

۱۳۔ سورۂ نور کی آیت لِیَسۡتَاۡذِنۡکُمُ الَّذِیۡنَ مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ الخ کہ گھریلو غلام، نوکر چاکر اور نابالغ لڑکے بھی تین اوقات (قبل از فجر، بعد از عشاء اور دوپہر) میں اجازت لے کر گھروں میں داخل ہوں، بعض کے نزدیک منسوخ ہے۔ عبداللہ بن عباسؓ کا معتمد علیہ کا مذہب یہی ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں، لوگوں نے سستی اور لاپرواہی سے اس پہ عمل ترک کر دیا ہے۔

۱۴۔ لَا یَحِلُّ لَکَ النِّسَآءُ مِنۡۢ بَعۡدُ (الاحزاب ۳۳/۵۲) کو اس آیت کی رو سے منسوخ

کہا گیا ہے۔ اِنَّا اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ اللَّاتِي الخ (۳۳: ۵۰)، شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ یہاں تلاوت میں ناسخ آیت مقدم ہے اور منسوخ مؤخر ہے۔ یعنی جس آیت کو ناسخ کہا گیا ہے دراصل وہ حکم میں مقدم ہے اور جسے منسوخ کہا گیا ہے وہ حکم میں مؤخر ہے، لہٰذا نسخ ثابت نہیں ہوا۔ مطلب یہ کہ اِنَّا اَحْلَلْنَا میں جس آزادی کو ظاہر کیا گیا ہے وہ لا یحل لک النساء سے محدود کر دی گئی ہے۔ پس دوسروں کے لیے تو چار کی پابندی تھی مگر حضورؐ کے لیے تمام موجود ازواج کو رکھنے کی اجازت دی گئی، کیونکہ ازواج رسولؐ امہات المومنین ہیں، انہیں چھوڑنے کی صورت میں کسی اور کا نکاح ان سے جائز نہ تھا۔ اور یہ تعدد ازواج صرف بعض دینی و معاشرتی مصالح کی خاطر تھا۔ شاہ صاحبؒ کی اس عبارت کا معنی یہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ وہ یہاں نسخ کو واقعی ثابت کرنا چاہتے ہیں، مگر اس سے چونکہ ان کی بیان کردہ تعداد (۵) قائم نہ رہتی اس لیے ہم نے یہ مطلب بیان کیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مفسر ابن عربیؒ اور علامہ سیوطیؒ کی بیان کردہ انیس آیات کا عدد یہاں ختم ہو جاتا ہے یعنی ۱۴ یہ اور پانچ اوپر والی آیات۔ ان کے علاوہ بھی بعض آیات کو چونکہ منسوخ کہا گیا ہے لہٰذا شاہ صاحبؒ نے انہیں بھی اسی ضمن میں بیان فرما دیا ہے۔ وہ آیات یہ ہیں:

۱۵۔ فَآتُوا الَّذِينَ ذَهَبَتْ أَزْوَاجُهُم مِّثْلَ مَا أَنفَقُوا (الممتحنہ ۱۱) یعنی جن مسلمانوں کی بیویاں کفار کے قبضہ میں رہ گئی ہوں انہیں معاوضہ دیا جائے۔ اس آیت کے متعلق کہا گیا ہے کہ آیتِ سیف یا آیتِ غنیمت سے منسوخ ہے، ان آیات میں قتالِ عام کا حکم دیا گیا ہے اور مالِ غنیمت کو حلال کر دیا گیا ہے لہٰذا معاوضے کا سوال منسوخ ہو گیا۔ شاہ صاحب کہتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ نہیں محکم ہے لیکن یہ حکم اس وقت ہے جبکہ کفار قوی ہوں اور ان سے بعض شرائط پر صلح کی جائے۔

۱۶۔ يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا (المزمل) اس آیت میں رات کا زیادہ حصہ عبادت کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی سورت کی آخری آیتوں میں یہ حکم منسوخ کر دیا گیا ہے اور پھر تہجد کی فرضیت کو نماز پنجگانہ کی فرضیت سے منسوخ کیا گیا۔ شاہ صاحبؒ کے نزدیک قم اللیل کا حکم شروع سے ہی بطورِ استحباب تھا نہ کہ بطور وجوب۔ سورت کے آخر میں اس استحباب میں مزید نرمی کر دی گئی ہے۔ گویا صرف تاکید کو نرم کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ نسخ نہیں ہے۔

اسبابِ نزول

اسبابِ نزول کی پہچان بھی تفسیر قرآن کے مشکل مضامین میں سے ہے۔ اس کا بڑا سبب بھی متقدمین اور متاخرین کی اصطلاحوں کا فرق ہے۔ صحابہ و تابعین جب کہیں کہ نزلت فی کذا تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس آیت میں یہ مضمون بھی بیان ہوا ہے۔ یہ مراد نہیں ہوتی کہ بعینہٖ یہ آیت اس واقعہ میں نازل ہوئی تھی۔ صرف غرض یہ ہوتی ہے کہ آیت فلاں واقعہ یا قصہ پر منطبق ہوتی ہے۔ بعض دفعہ لوگوں نے حضورؐ سے کوئی مسئلہ دریافت کیا اور آپؐ نے قرآن مجید کی کسی آیت سے استنباط و اجتہاد سے اس کا جواب دیا، یا بطور شاہد و دلیل کوئی آیت پڑھ دی، تو بعد میں لوگ کہنے لگے کہ نزلت فی کذا (یہ آیت فلاں موقع پر یا فلاں قصہ میں اتری تھی)

بعض دفعہ محدثین اسبابِ نزول کے سلسلے میں ایسی چیزوں کا ذکر کرتے ہیں جو دراصل سببِ نزول نہیں ہوتیں، مثلاً

ا۔ صحابہؓ نے بحث و تمحیص میں بطور شاہد کسی آیت کو پیش کیا ہو۔

ب۔ صحابہ نے باہم گفتگو میں مثال کے طور پر کوئی آیت پڑھی ہو۔

ج۔ صحابہؓ نے کسی موقع پر حضورؐ کی تلاوتِ آیت کو بطور استدلال پیش کیا ہو۔

د۔ آیت کی وضاحت میں اسی مضمون کی کوئی حدیث پیش کر دی ہو۔

ھ۔ آیت کے نزول کا موقع متعین کرنے کے لیے اس کی تلاوت کی ہو۔

و۔ آیت میں جو نام مبہم ہو ان کا تعین کیا ہو۔

ز۔ قرآن مجید کے کسی لفظ کو بذریعہ تلفظ سمجھایا ہو۔

ح۔ قرآن مجید کی آیات یا سورہ کے فضائل کا بیان کیا ہو۔

ط۔ حضورؐ نے کسی قرآنی امر پر جیسے عمل کیا تھا اس کا اظہار کیا ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔

قرآن کے مفسر کے لیے ان تمام چیزوں کو تفصیلی طور پر جاننا ضروری نہیں، ہاں دو چیزوں کا علم اس کے لیے ضروری ہے۔

۱۔ جن واقعات اور قصوں کا اشارہ قرآن مجید میں ہے چونکہ ان کے علم کے بغیر فہم آیات ممکن نہیں لہٰذا ان واقعات کا علم مفسر کے لیے لازم ہے۔

۲۔ جن اجزاء سے عام کو خاص بنایا جاتا ہے، یا کوئی اور فائدہ حاصل ہوتا ہے ان اجزاء کا علم بھی ضروری ہے مثلاً کلام کو ظاہر سے پھیرنے کی وجوہ کا علم لازم ہے

اس کے بغیر آیت کی تفسیر ممکن نہیں۔
یہ اچھی طرح سمجھ لینا واجب ہے کہ تفسیر کے قصے حدیث میں کم ہی بیان ہوئے ہیں مفسرین نے اس سلسلے میں جو طویل قصے بیان کیے ہیں وہ الا ماشاء اللہ اہل کتاب سے لیے گئے ہیں۔ حضورؐ کی حدیث یہ ہے کہ اہل کتاب کی تصدیق یا تکذیب مت کرو۔ یعنی جن چیزوں کی صراحت و وضاحت سے کتاب و سنت خاموش ہیں ان میں اسرائیلی روایات پر اعتماد کرنا یا انہیں رد کرنا درست نہیں۔ پس اسرائیلی روایات کو تفسیر میں بیان کرنا ٹھیک نہ ہوا۔
صحابہؓ و تابعین بعض دفعہ مشرکین اور اہل کتاب کے مذاہب اور زمانۂ جاہلیت کی عادات و رسوم کی وضاحت یا ان کے رد کے لیے ان کا ذکر کرتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ فلاں آیت سے یہ رسوم و مذاہب واضح ہوتے ہیں (نزلت فی کذا) یہ مطلب نہیں ہوتا کہ خاص یہی واقعات اس آیت کے نزول کا سبب بنے تھے۔ ممکن ہے کہ اس قسم کے دوسرے واقعات میں یا ان کے آگے پیچھے وہ آیت اتری ہو اور بطور وضاحت ان حضرات نے یہ کہہ دیا ہو کہ یہ آیت فلاں واقعہ یا قصہ میں اتری تھی۔ گویا وہ بطور مثال اس واقعہ کو اس آیت کی تفسیر میں پیش کرتے ہیں۔ پھر بعض دفعہ ان حضرات کے بیانات میں اختلاف بھی ہوتا ہے جسے دیکھ کر لوگ گھبرا جاتے ہیں، حالانکہ اصولاً سب بیان متحد ہوتے ہیں۔ اسی لیے حضرت ابوالدرداءؓ نے فرمایا کہ جب تک کوئی شخص ایک آیت کو کئی واقعات پر منطبق کرنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو، فقیہ نہیں ہو سکتا۔
قرآن مجید نے نیک بخت اور بدبخت انسانوں کا ذکر متعدد آیات میں فرمایا ہے ان کے اوصاف اور اسباب سعادت و شقاوت بیان کیے ہیں۔ ان آیات میں کسی خاص شخصیت کا بیان نہیں ہوتا بلکہ عام طور پر سعید و شقی کا حال بطور علامت بیان کیا گیا ہے، مثلاً :

وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا الآیہ
وَإِذَا قِيلَ لَهُم مَّاذَا أَنزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ۝
وَقِيلَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا مَاذَا أَنزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوا خَيْرًا

اسی طرح مندرجہ ذیل آیات میں ذوات و اشخاص کا ذکر نہیں، بلکہ علامات و اوصاف بیان فرمائے ہیں۔ وہ جہاں بھی صادق آجائیں یہ آیات ان پر منطبق ہو جائیں گی :

ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً الخ (۱۶ : ۱۱۲)

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا فَلَمَّا تَغَشّٰهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا الاٰيۃ (۷ : ۱۸۹)

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِىْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ٥

لَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ (۶۸ : ۱۰)

كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ الاٰيۃ (۲ : ۲۶۱)

ان آیات میں سے پہلی آیت میں کوئی خاص بستی، دوسری میں کوئی خاص انسان تیسری میں چند خاص مومن، چوتھی میں کوئی خاص جھوٹا آدمی اور پانچویں میں کوئی خاص دانہ مراد نہیں۔ بلکہ یہ بطور تمثیل وعلامت کچھ لوگوں یا اشیاء کا ذکر کیا گیا ہے پھر اگر یہ تمثیلات کہیں چسپاں ہو جائیں تو یہ نہ کہا جائے گا کہ آیات سے مراد یہی شخص یا چیز تھی، بلکہ کہا جائے گا کہ ایسا لازم نہ تھا مگر واقع ہو گیا ہے۔

بعض دفعہ قرآن میں کسی پیدا ہو سکنے والے شبے کو دور کیا جاتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ واقعی یہ شبہ کسی کو پیش بھی آیا تھا۔ اسی طرح کسی پیدا ہو سکنے والے سوال کا جواب دیا جاتا ہے تاکہ بات واضح ہو جائے، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ واقعی یہ سوال کیا گیا تھا جس کا جواب دیا گیا ہے۔ ایسے موقعوں پر صحابہؓ باہمی گفتگو میں سوال وجواب کی صورت میں ایسی آیات کو پیش کرتے تھے، اگر ساری گفتگو دیکھی جائے تو معلوم ہو گا کہ سارا کلام مسلسل ہے اور ایسا نہیں ہوا کہ کوئی سبب پیش آیا تھا جس کے باعث فلاں آیت اتری۔

بعض دفعہ صحابہؓ اپنے کلام میں واقعات کو آگے پیچھے کر کے بیان کرتے ہیں جس سے مراد زمانہ کے لحاظ سے تقدیم وتاخیر نہیں ہوتی بلکہ رتبہ ودرجہ کے لحاظ سے ہوتی ہے، جیسے وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ والی آیت سورۂ توبہ میں ہے جو آخری سورت

ہے۔ زکوٰۃ کا حکم اس سے کئی برس پہلے آچکا تھا، مگر عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ اس آیت کا حکم نزول زکوٰۃ سے پہلے کا ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ فرضیت زکوٰۃ کے بعد جو شخص یہ فریضہ ادا کرے وہ اس آیت کی وعید کا مستوجب نہیں۔ نہ یہ کہ یہ آیت حکم زکوٰۃ سے پہلے اتری تھی۔

مفسّر کو کن اسباب نزول کا علم واجب ہے

تفسیر کرنے والے کو دو قسم کے اسباب نزول کا جاننا ضروری ہے:

ا۔ جن غزوات یا واقعات کی طرف آیتوں میں اشارے پائے جاتے ہیں ان کا علم ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر ان کی حقیقت معلوم نہیں ہو سکتی۔

ب۔ آیات میں جو بعض قیود پائی جاتی ہیں ان کے فوائد کا علم ضروری ہے، اسی طرح بعض مقامات پر جو سختی کا اظہار ہے اس کے اسباب کا علم لازم ہے اور یہ بحث اصل میں "فن توجیہ" کی ایک شاخ ہے

فن توجیہ توجیہ کا لفظ وجہ سے نکلا ہے، اس کا معنی ہے "کلام کی اصلی صورت دکھانا" مراد اس سے یہ ہے کہ کسی آیت میں پیدا ہونے والے شبہ کا باعث یا تو اصل مطلب کا ذہن سے بعید ہونا ہے یا بہ ظاہر دو آیتوں میں تناقض کا نظر آنا، کیونکہ زیر تفسیر آیت کی تصدیق کرنے والی کوئی اور آیت مبتدی کے ذہن میں نہیں ہوتی یا کسی آیت میں لگی ہوئی قید اس کی سمجھ سے بالاتر ہوتی ہے۔ ان چیزوں کو حل کر دینا "توجیہ" کہلاتا ہے مثلاً:

۱۔ یَاُخْتَ هَارُوْنَ کا لفظ یہود نے مریمؑ سے خطاب کر کے کہا تھا، حالانکہ دراصل مریمؑ ہارون علیہ السلام کی اولاد سے تھیں۔ شبہ کا منشاء یہ ہے کہ سائل نے آیت میں ہارون کے لفظ سے ہارونؑ پیغمبر سمجھ لیا۔ حضورؐ نے جواب دیا کہ یہ ہارون پیغمبر نہیں بلکہ مریمؑ کے بھائی ہیں۔ بزرگوں کے نام پر اولاد کا نام رکھنا لوگوں میں شائع و ذائع ہے۔

۲۔ یَمْشِیْ مُکِبًّا عَلٰی وَجْهِهٖ سے لوگوں کو حیرت ہوئی تو حضورؐ سے دریافت کیا گیا کہ کوئی منہ کے بل کیسے چل سکے گا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ جس خدا نے اسے پاؤں پر چلایا وہ منہ کے بل بھی چلا سکتا ہے۔

۳۔ قیامت کے بارے میں ایک آیت میں ہے کہ اَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰی بَعْضٍ یَّتَسَآءَلُوْنَ اور دوسری آیت میں ہے لَا یَتَسَآءَلُوْنَ۔ بظاہر ان میں تناقض ہے چنانچہ ابن عباسؓ سے اس کا حل پوچھا گیا تو فرمایا کہ سوال کی نفی کا تعلق میدان قیامت سے ہے اور اثبات کا تعلق داخلہ جنت کے بعد سے ہے اب کوئی تضاد نہ رہا۔

۴۔ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِ اَنْ یَّطَّوَّفَ بِهِمَا۔ یعنی صفا و مروہ کی سعی کرنے سے کوئی حرج نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ فعل حج یا عمرہ میں واجب نہیں حالانکہ دوسرے دلائل سے اسے واجب کہا جاتا ہے ام المومنین عائشہؓ سے اس کا

حل پوچھا تو فرمایا کہ زمانۂ جاہلیت میں ان پہاڑوں پر بت ہوتے تھے۔ اسلام آیا تو لوگوں نے ان کی سعی میں گناہ سمجھا۔ اسی شبہ کے جواب میں فرمایا گیا کہ سعیٔ صفا و مروہ گناہ نہیں۔

۵۔ صلوٰۃ سفر کے ذکر میں اِنْ خِفْتُمْ کا لفظ آیا ہے، اس سے یہ شبہ ہوا کہ جب سفر میں نقصِ یا دشمن وغیرہ کا خوف نہ ہو تو نماز میں قصر نہیں ہوگا۔ حالانکہ حضورؐ کی صحیح سنت و حدیث سے اس کے خلاف ثابت ہے۔ حضورؐ نے اس شبہ کا جواب یہ دیا کہ جب سفر کی نماز کا حکم آیا تھا تو خوف موجود تھا اس لیے خوف کا ذکر کیا گیا، لیکن بعد میں یہ خدا کا احسان ہے جسے تشکر کے ساتھ قبول کرنا چاہیئے۔

اسبابِ نزول کے سلسلے میں ابنِ اسحاقؒ، واقدی اور کلبیؒ نے بہت افراط کی ہے کہ ہر آیت کے تحت کوئی نہ کوئی قصہ بیان کیا ہے۔ ان میں سے اکثر محدثین کے ہاں صحیح نہیں، ان کی اسناد بھی مشکوک ہیں لہذا انہیں تفسیر سمجھنا غلطی ہے۔ اس سلسلے میں بخاریؒ، ترمذی اور حاکمؒ کے بیان کردہ صحیح الاسناد اسبابِ نزول درست ہیں، اور ان کا جاننا مفسر کے لیے مفید ہے۔

دیگر اسبابِ خفائے معنیٰ

کلام معنی ان وجوہ سے مخفی ہوتا ہے :-

ا۔ حذف
ب۔ ابدال
ج۔ تقدیم و تاخیر اور امر بعید سے تعلق
د۔ متشابہ، تعریض اور کنایہ کا استعمال
ھ۔ استعارہ اور مجاز عقلی کا استعمال
و۔ اضافہ وغیرہ۔

حذف کی مثالیں

حذف کا معنی ہے کلام کے اجزاء کلمات یا حروف کا ذکر نہ کرنا، اور اس کی کئی اقسام ہیں یعنی مضاف کا حذف، موصوف کا حذف یا متعلقاتِ کلام کا حذف۔ مثلاً :

ولکن البر من آمن یعنی بر من آمن — یہاں مضاف محذوف ہے

و آتینا ثمود الناقۃ مبصرۃ یعنی آیۃ مبصرۃ — یہاں موصوف محذوف ہے

واشربوا فی قلوبہم العجل یعنی حب العجل — یہاں مضاف محذوف ہے

اقتلت نفسا زکیۃ بغیر نفس یعنی بغیر قتل نفس — حذف مضاف کی مثال

او فساد یعنی او بغیر فساد — جزو جملہ کے حذف کی مثال

من فی السموات والارض یعنی ومن فی الارض — 〃 〃 〃

ضعف الحیوۃ وضعف الممات یعنی ضعف عذاب الحیوۃ وضعف عذاب الممات — 〃 〃

واسئل القریۃ یعنی اھل القریۃ — حذف مضاف کی مثال

بدلوا نعمۃ اللہ کفرًا یعنی فعلوا مکان شکر نعمۃ اللہ کفرًا — حذف متعلقات اور ابدال کی مثال

یھدی للتی ھی اقوم یعنی للخصلۃ اللتی اقوم — حذف موصوف کی مثال

ادفع بالتی ھی احسن یعنی بالخصلۃ التی ھی اقوم — 〃 〃 〃

سبقت لہم منا الحسنیٰ یعنی الکلمۃ الحسنیٰ والعدۃ الحسنیٰ — 〃 〃

علی ملک سلیمان یعنی علی عہد ملک سلیمان — حذف مضاف

وعدتنا علی رسلک یعنی علی السنۃ رسلک — 〃 〃

انزلناہ فی لیلۃ القدر یعنی انزلنا القراٰن — ابدال کی مثال۔ قرآن کا ذکر پہلے نہیں گزرا مگر اس کی جگہ ضمیر لائی گئی ہے

حتی توارت بالحجاب یعنی توارت الشمس — فاعل کا حذف

وعبد الطاغوت یعنی وجعل منہم من عبد الطاغوت — جزو جملہ کے حذف کی مثال

فجعلہ لہ سھوا یعنی جعل لہ — حرفِ جر کے حذف کی مثال

واختار موسیٰ قومہ یعنی من قومہ — 〃 〃 〃

ان عادا کفروا ربہم یعنی کفروا نعمۃ ربہم — حذف مضاف

یا کفرۃ ابربہم — حذف حرفِ جر

تفتؤ تذکر یعنی لا تفتؤ (لا تزال) — حذف حرف نفی

ما نعبدھم الا لیقربونا یعنی یقولون ما نعبدھم — حذف فعل کی مثال

ان الذین اتخذوا العجل یعنی العجل الھا — حذف مفعول

کنتم تاتوننا عن الیمین یعنی وعن الشمال — حذف جزوِ جملہ

لو نشاء لجعلنا منکم الھا یعنی بدلا منکم — حذفِ مفعول

انا لمغرمون یعنی تقولون انا ...... حذف فعل

کما اخرجک ربک یعنی امض کما .....

جب بعد میں آنے والی عبارت سے حذف معلوم ہو سکتا ہو تو اِنَّ کی خبر، شرط کی جزاء، مفعول اور مبتدا وغیرہ عام طور پر قرآن مجید میں محذوف ہوتے ہیں۔

فلو شاء لهدا کم — لو شاء هدا ایکم — حذف مفعول

الحق من ربک یعنی هذ الحق — حذف اسم اشارہ

لا یستوی منکم من انفق من قبل الفتح و قاتل . اولئک

یعنی لا یستوی منکم من انفق من قبل الفتح ومن انفق من بعد الفتح

(حذف جملہ کی مثال)

واذا قیل لهم اتقوا ما بین ایدیکم ..... یعنی اعرضوا حذف جزاء کی مثال

واذ قال ربک ..... واذ تاذن ربکم ..... اذ قال موسیٰ وغیرہ میں اِذْ

مفاجات وتہویل کے لیے ہے حالانکہ اصل میں یہ فعل ظرف کا ہوتا ہے۔ ان آیات میں توجہ کرنے، ڈرانے اور شوق دلانے کے لیے آتا ہے۔ اَنْ مصدریہ کے پہلے سے حرف جر کو حذف کر دینا عربی زبان میں عام ہے۔ اَنْ کا معنی کبھی لِاَنْ، کبھی بِاَن اور کبھی اِنَّ ہوتا ہے وَلَوْ کے بعد کبھی جواب شرط آتا ہے کبھی نہیں آتا مثلاً

ولو تری اذ الظلمون فی غمرات الموت — حذف جزاء

ولو یری الذین ظلموا اذ یرون العذاب

ان مثالوں میں جزاء کی تلاش بے فائدہ ہے کیونکہ یہاں محض تعجب پیدا کرنا مدنظر ہوتا ہے، شرط وجزاء کا معنی مقصود نہیں ہوتا۔

اِبدال یعنی کلام میں تصرف کرنا یعنی ایک فعل کی جگہ دوسرا، ایک فاعل کی جگہ دوسرا، واحد مؤنث کی جگہ جمع مذکر، جمع مؤنث کی جگہ جمع مذکر، واحد کی بجائے جمع مذکر وغیرہ لانا:

أهذا الذی یذکر الهتکم یعنی یسبّ الهتکم ابدال فعل بوجہ کراہت لفظ سب

هم منا لا یصحبون یعنی لا ینصرون ابدال فعل، کیونکہ نصرت کو صحبت لازم ہے

ثقلت فی السموات والارض یعنی خفیت، کیونکہ مخفی چیز کا علم دشوار ہے

فان طبن لکم یعنی عفون، کیونکہ طبن میں دلی خوشی کا اظہار ہے

فظلت اعناقهم لها خاضعین یعنی خاضعة — ابدال خبر کی مثال

فکانت من القانتین یعنی من القانتات — مؤنث کی جگہ مذکر کی مثال

وما لھم من ناصرین یعنی من ناصر — واحد کی جگہ جمع کی مثال

فما منکم من احد عنہ حاجزین یعنی حاجزاً — " "

والعصر ان الانسان لفی خسر یعنی بنی آدم — جمع کی بجائے اسم جمع کی مثال

یا یھا الانسان یعنی یا بنی آدم — " "

وحملھا الانسان یعنی بنو آدم — " "

کذبت قوم نوح ن المرسلین یعنی نوحًا — جمع کی جگہ واحد، کیونکہ ایک رسول کی تکذیب سب کی تکذیب ہے

انا فتحنا لک .... یعنی انی فتحت — واحد کی بجائے جمع، شاہانہ طرز خطاب ہے۔

انا لقادرون یعنی انی لقادر — " "

ولکن اللہ یسلط رسلہ یعنی رسولہ محمداً — واحد کی بجائے جمع

الذین قال لھم الناس یعنی عروۃ الثقفی — واحد کی جگہ جمع

فاذاقھا اللہ لباس الجوع والخوف یعنی الجوع والخوف۔ لباس کا لفظ اس لیے لایا گیا ہے کہ بھوک اور خوف لباس کی مانند ڈھانک لیتے ہیں۔

صبغۃ اللہ یعنی دین اللہ — دین کا رنگ دلوں کو پختہ طور پہ چڑھتا ہے لہٰذا اسے صبغہ کہا گیا

وطور سینین یعنی سیناء — سیناء کو سینین سے بدل دیا گیا

سلام علی الیاسین یعنی الیاس — "قافیے اور وزن کی خاطر الیاس کو الیاسین بنا دیا گیا"

فلما تجلی ربہ للجبل یعنی علی الجبل — حرف کے ابدال کی مثال

ھم لھا سابقون یعنی الیھا سابقون — " "

لا یخاف لدی المرسلون الا من ظلم یعنی لکن من ظلم — " "

لا صلبنکم فی جذوع النخل یعنی علی جذوع النخل — " "

ام لھم سلم یستمعون فیہ یعنی علیہ — " "

السماء منفطر بہ یعنی فیہ — ابدالِ حروف کی مثال

مستکبرون بہ یعنی عنہ

اخذتہ العزۃ بالاثم یعنی حملتہ العزۃ علی الاثم — " "

فاسئل بہ خبیرا یعنی فاسئل عنہ — " "

لا تاکلوا اموالھم الی اموالکم یعنی مع اموالکم — " "

وایدیکم الی المرافق یعنی مع المرافق — ابدالِ حروف کی مثال
عینا یشرب بہا یعنی عنہا
ماقدروا اللہ حق قدرہ اذ قالوا یعنی ان قالوا۔
وان تخالطوھم فاخوانکم یعنی لاباس بذالک لانہم اخوانکم — ابدالِ جملہ
لمثوبۃ من عند اللہ خیر یعنی لوجدوا ثوابا من عند اللہ
ان یسرق فقد سرق اخ لہ یعنی ان سرق فلا تعجب الخ
من کان عدوا لجبریل فانہ نزلہ یعنی من کان عدو الجبریل فان اللہ عدو لہ
وقیلہ یارب یعنی رب قیل لہ یارب
حق الیقین یعنی حق یقین — نکرہ کی جگہ معرفہ لایا گیا تاکہ تلفظ میں آسانی ہو
فلما رای الشمس بازغۃ قال ھذا ربی — معنی ومفہوم کے لحاظ سے مؤنث کی جگہ اسم اشارہ مذکر لایا گیا۔
فلما اضاءت ماحولہ ذھب اللہ بنورھم یعنی بنورہ — واحد کی جگہ جمع کی ضمیر آئی ہے
اغناھم اللہ ورسولہ من فضلہ یعنی فضلہما — تثنیہ کی جگہ واحد کی ضمیر
ان کنت علی بینۃ من ربی واتانی رحمۃ.... فعمیت یعنی فعمیتا
(یعنی معجزہ اور رحمت دونوں سے تم اندھے ہو گئے ہو)
والنازعات غرقا۔ والناشطات نشطا۔ والسابحات سبحا۔ فالسابقات سبقا فالمدبرات امرا۔ یوم ترجف الراجفۃ پہلی پانچ آیتیں جملۂ قسمیہ بطورِ قسم ہیں اور چھٹی آیت بطورِ جزاء اور جوابِ قسم ہے۔ نہ شرط بصورتِ شرط ہے نہ جملۂ قسمیہ کا جواب بطورِ جواب۔ ایسے موقع پر تنبیہ مدِنظر ہوتی ہے اور شرط کو جزاء کی دلیل بناتے ہیں۔ اسی طرح سورۂ بروج کی پہلی تین آیتیں بطورِ قسم ہیں اور چوتھی قتل اصحاب الاخدود النار ذات الوقود بطورِ جوابِ قسم ہے، اور قسم کو جوابِ قسم کی حقانیت کی دلیل بنایا ہے۔ اسی طرح سورۂ انشقاق کی پہلی پانچ آیتوں اذا السماء انشقت کو چھٹی آیت یاایھا الانسان انک کادح الخ پر بطورِ شاہد و دلیل لایا گیا ہے۔
حتی اذا کنتم فی الفلک وجرین بہم یعنی بکم — مخاطب کی جگہ ضمیر غائب لائے ہیں
فامشوا فی مناکبہا یعنی تمشون فی مناکبہا — ابدالِ فعل، مضارع کی جگہ امر
ان کنتم مؤمنین یعنی ایمانکم یقتضی ھذا — جملۂ خبریہ کا ابدال انشائیہ سے
من اجل ذالک کتبنا علی بنی اسرائیل یعنی تمثیل ھذہ الاحوال۔ شالِ احوال کی جگہ مِن اَجل کا لفظ ہے

أرأيت۔ یہ استفہام بطور تنبیہ و تعجب ہے۔

امر بعید سے تعلق اور تقدیم و تاخیر کلام

وارجلکم الی الکعبین کا تعلق فاغسلوا کے ساتھ ہے، جس پر اس کا فتح دلالت کرتا ہے

فما یکذبک بعد بالدین یہ جملہ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم سے ملحق ہے۔ درمیان میں اور کلام آگیا ہے۔

یدعوا لمن ضرہ .... یعنی من ضرہ اقرب من نفعہ

الا آل لوط۔ انا لمنجوھم اجمعین الا امراتہ دو دفعہ الا کی وجہ سے کلام میں خفاء پیدا ہوگیا ہے۔

لولا کلمۃ سبقت من ربک لکان لزاما واجل مسمی۔ دراصل عبارت یوں ہے: لولا کلمۃ سبقت من ربک واجل مسمی لکان لزاما

لتنوء بالعصبۃ اولی القوۃ یعنی لتنوء العصبۃ بھا

وان استنصروکم فی الدین فعلیکم النصر

الا تفعلوہ تکن فتنۃ فی الارض وفساد کبیر۔ فعلیکم النصر کے بعد کی عبارت ..... درمیان میں حائل ہے اور الا کا تعلق فعلیکم النصر کے ساتھ ہے۔

قد کانت لکم اسوۃ حسنۃ فی ابراھیم والذین معہ ....

.... اس مسلسل کلام کے درمیان میں بہت سی عبارت حائل ہو کر تقدیم و تاخیر ہو گئی ہے۔

یسئلونک کانک حفی عنھا یعنی یسئلونک عنھا کانک حفی

اضافہ

بعض دفعہ مروّج کلام میں صفت زائد ہوتی ہے، مثلاً:

ولا طائر یطیر بجناحیہ۔ اس میں جملۂ فعلیہ جو طائر کی صفت ہے، زائد ہے۔ اور اس کا فائدہ وضاحت و صراحت ہے۔ اسی طرح ان الانسان خلق ھلوعا سے اگلی دو آیات میں ھلوعاً کی صفت بطور وضاحت آئی ہے۔ یعنی اذا مسہ الشر جزوعا۔ واذا مسہ الخیر منوعا۔

للذین استضعفوا لمن آمن منھم میں لمن آمن منھم وضاحت و شرح کے لیے آیا ہے اور قاعدۂ عربیت کے لحاظ سے زائد ہے۔

حتی اذا بلغ اشدہ وبلغ اربعین سنۃ میں دو کے بعد کا جملہ بطور عطف

تفسیری زائد ہے

وما یتبع الذین یدعون من دون اللہ شرکاء ان یتبعون الا الظن

خط کشیدہ جملہ میں پہلے جملہ کا تکرار ہے اور بروئے قواعد زائد ہے۔ اگر اسے نکال دیں تو بھی مطلب واضح ہے مگر یہ تحسین و تزئینِ کلام کا باعث ہے۔

ولما جاءھم کتاب .... فلما جاءھم ما عرفوا الخ چونکہ کتاب کے بعد والے کلام سے کافی فاصلہ ہوگیا تھا اس لیے فلما جاءھم کا تکرار ہوا۔

ولیخش الذین لو ترکوا .... خافوا علیھم خشیت اور خوف ہم معنی ہیں لہٰذا خافوا زائد ہے جس سے مزید وضاحت و تحسینِ کلام مطلوب ہے۔

قل ھی مواقیت للناس والحج اگر یہ آیت یوں ہوتی تو مزید اختصار ہوتا: ھی مواقیت للناس فی حجھم لیکن اس صورت میں معنی کی عمومیت نہ رہتی جواب سے یعنی ہلال صرف حج سے ہی خاص نہیں بلکہ عام مواعید اور حساب و کتاب بھی اسی پر مبنی ہے۔

لتنذر ام القری ومن حولھا وتنذر یوم الجمع اس میں تنذرُ کا تکرار ہے جو پہلے لفظ کی تشریح و تفسیر کرتا ہے۔

وتری الجبال تحسبھا جامدۃ۔ تحسبھا کا اضافہ تریٰ کی تشریح کرتا ہے کہ یہاں رویت سے مراد گمان کرنا ہے۔

کان الناس امۃ واحدۃ .... لیحکم بین الناس فیما اختلفوا فیہ ط وما اختلف فیہ الخ اس میں آخری جملہ فیما اختلفوا کی وضاحت کے لیے مکرر لایا گیا ہے۔

یوم یحمیٰ علیھا فی نار جھنم یعنی یوم تحمیٰ فی نار جھنم اس میں علیھا زائد ہے۔

وقفینا علی آثارھم بعیسی بن مریم یعنی قفینا ھم بعیسی یہاں علی آثارھم تحسین و تزئینِ کلام اور وضاحت کے لیے زائد آیا ہے۔

واذا وقعت الواقعۃ میں و حرف عطف نہیں بلکہ تاکیدِ اتصال کے لیے ہے۔ اسی طرح ان آیات میں وفتحت ابوابھا۔ ولیمحص اللہ۔ اذ یقول المنٰفقون والذین فی قلوبھم مرض۔ یہ واوٗ تفسیر و توضیح کے لیے ہے نہ کہ عطف کے لیے۔ اس کی مثال سیبویہ نحوی نے یہ لکھی ہے مررت بزید وصاحبک یعنی وہی زید جو

تیرا ساتھی ہے۔ پس اس میں و عطف کی نہیں بلکہ تفسیر کی ہے۔

وما اھلکنا من قریۃ الا ولھا کتاب معلوم میں لھا کتاب معلوم قریۃ کی صفت ہے جیسے دوسری آیت میں ہے وما اھلکنا من قریۃ الا لھا منذرون پس یہاں وَ زائد ہے۔ یہ تو زمخشری کا قول ہے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ یہاں واؤ تاکیدِ اتصالی کے لیے ہے جیساکہ وَ حالیہ کا قاعدہ ہے۔ لیکن واؤ کا لانا ضروری نہیں مثلاً جارنی زید علیہ ثوب اور جارنی زید وعلیہ ثوب دونوں کا ایک ہی معنی ہے۔

اِنتشارِ ضمائر اور اختلافِ مطالب

بعض دفعہ ضمیروں کے منتشر ہونے اور ایک ہی کلمہ کے دو معنی مراد لینے سے فہم کلام میں دشواری ہوتی ہے جیسے: وانھم لیصدونھم عن السبیل ویحسبون انھم مھتدون یعنی وہ (شیطان) لوگوں کو راہ سے بھٹکاتے ہیں اور وہ لوگ اپنے آپ کو ہدایت پر سمجھتے ہیں۔ معنی سے انتشارِ ضمائر واضح ہے۔ اسی طرح قَرِیْنُہٗ کا لفظ سورۂ قاف میں (آیت ۲۳، ۲۷) دو بار آیا ہے۔ پہلے قرین سے شیطان اور دوسرے سے فرشتہ مراد ہے، یہ ایک لفظ کے مختلف معانی کی مثال ہے۔ پہلی انتشارِ ضمائر کی تھی۔

سورۂ البقرہ (آیات ۲۱۵، ۲۱۹) میں مَاذَا الگ الگ معنوں میں آیا ہے:

یسئلونک ماذا ینفقون ۵ قل ما انفقتم الخ یہاں مَاذَا سے مراد کیفیتِ انفاق ہے۔ یسئلونک ماذا ینفقون ۵ قل العفو ط یہاں مَاذَا کمیت کے لیے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جواب مختلف ہے۔

جعل الظلمات والنور میں جعل بمعنی خَلَقَ ہے وجعلوا للہ مما ذرا میں بمعنی عقیدہ ہے۔

لفظ شیئ کے بھی مختلف معانی ہیں۔ کبھی فاعل کی جگہ، کبھی مفعول بہ اور کبھی مفعولِ مطلق وغیرہ کی جگہ آتا ہے جیسے ام خلقوا من غیر شیئ میں شیئ بمعنی خالق ہے۔ یہاں یہ فاعل کی جگہ آیا ہے۔ فلا تسئلنی عن شیئ میں بمعنی مفعول استعمال ہوا ہے۔

امر، نبأ اور خطب کے الفاظ بھی مختلف معانی کے لیے آتے ہیں جیسے نبأ عظیم عجیب واقعہ۔ اسی طرح خیر و شر کے الفاظ اور ان کے دیگر مترادفات کے معانی بھی

اختلافِ مقام سے مختلف ہوجاتے ہیں۔

یہی حال انتشارِ آیات کا ہے، بعض دفعہ کوئی آیت قصہ کی ابتداء میں لائی جاتی ہے حالانکہ اس کا مقام آخر میں ہوتا ہے۔

اسی طرح کوئی آیت نزول میں مقدم مگر تلاوت میں مؤخر ہوتی ہے، قد نری تقلب وجھک نزول میں مقدم ہے اور سیقول السفھاء مؤخر۔ مگر تلاوت میں معاملہ برعکس ہے۔

کبھی اثنائے کلام میں کفار کے سوال کا جواب آتا ہے، جیسے ولا تومنوا الا لمن تبع دینکم ان یؤتیٰ احد ...... قل ان الھدیٰ الخ۔

محکم محکم وہ کلام ہے جس کو سن کر اہل زبان یا زبان جاننے والا، وہی معنی سمجھے جس کے لیے وہ بنایا گیا ہے۔ لیکن فہم میں اعتبار عربوں کا ہے، ورنہ آج کل کے جدت پسند عالم تو بال کی کھال اتارتے اور محکم کو بھی متشابہ بنا ڈالتے ہیں۔

متشابہ متشابہ وہ کلام ہے جس کے ایک سے زیادہ معنی ممکن ہوں، مثلاً ایک ضمیر کے دو مرجع ہو سکتے ہوں تو اشتباہ پڑ جائے گا: ان الامیر امرنی ان العن فلانا لعنہ اللّٰہ۔ پس لعنہ میں امیر بھی مراد ہو سکتا ہے اور فلاں بھی۔ اسی طرح ایک لفظ جب دو معنی رکھے تو اشتباہ ہو جاتا ہے مثلاً لامستم النساء۔ ملامست کا معنی مس کرنا اور جماع دونوں ہیں۔ بعض دفعہ معطوف کا معطوف علیہ قریب ہوتا ہے اور کبھی بعید بھی ہوتا ہے، مثلاً وامسحوا برؤسکم وارجلکم یہاں ارجلکم کا عطف وجوھکم اور ایدیکم پر ہے اس لیے پاؤں کو دھونا فرض ہے لیکن اگر اس کا عطف رؤسکم پہ مانا جائے تو پاؤں کا مسح فرض ہوگا۔ لیکن سنت نے واضح کر دیا ہے کہ پاؤں کا دھونا فرض ہے لہٰذا ارجلکمُ صحیح ہے اور متواتر قراءت بھی یہی ہے۔

بعض دفعہ ایک جملہ پہلے پر معطوف بھی ہو سکتا ہے اور نیا کلام بھی، اس وجہ سے اشتباہ ہو جاتا ہے مثلاً ما یعلم تاویلہ الا اللّٰہ والراسخون فی العلم (آل عمران: ۷) اگر اللہ پہ وقف ہو تو معنی یہ ہوگا کہ اللہ کے سوا متشابہات کی تاویل کوئی نہیں جانتا۔ لیکن اگر یہاں وقف نہ ہو تو معنی یہ ہے کہ متشابہات کی تاویل اللہ اور پختہ علم والوں کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

کنایہ کسی لفظ یا کلام سے ظاہری معنی نہیں بلکہ اس کا لازم مراد لینا کنایہ ہے مثلاً عظیم الرماد بول کر سخی مراد لینا، کہ سخاوت راکھ کے بڑے ڈھیر کا لازم ہے۔ یعنی وہ شخص اتنا مہمان نواز ہے کہ اس کے ہاں زیادہ آگ جلنے کی وجہ سے راکھ کا ڈھیر لگا رہتا ہے۔ اسی طرح جیداء مبسوطتان کرم وسخاوت سے کنایہ ہے۔ اپنے دلی خیالات کا اظہار محسوسات کے ذریعہ سے کرنا بھی کنایہ ہے کلام عرب میں کنایہ کا استعمال بہت عام اور وسیع ہے، مثلاً:

واجلب علیهم بخیلك ورجلك۔ اس آیت میں ابلیس کو رہزنوں کے سردار سے تشبیہ دی ہے جو بوقت رہزنی اپنے سواروں اور پیادوں سے حملہ آور ہوتا ہے۔

وجعلنا فی اعناقهم اغلالا فهی الی الاذقان فهم مقمحون و جعلنا من بین ایدیهم سدا ومن خلفهم سدا فاغشینٰهم فهم لا یبصرون ٥ اس آیت میں اندھی تقلید کرنے والے کافروں کو ایسے قیدیوں سے تشبیہ دی ہے (بطور کنایہ)، جن کے گلوں میں بھاری طوق ہوں اور وہ گردن نہ اٹھا سکیں اور ان کے آگے پیچھے اونچی دیواریں ہوں کہ وہ کچھ دیکھ نہ سکیں۔

علیٰ ہذا القیاس کسی کی شجاعت بتانے کے لیے اپنے ہاتھ ادھر ادھر گھما کر دکھاتے ہیں کہ وہ بڑا شمشیر زن ہے۔ یا کسی کا یہ مقولہ نقل کرنا کہ: "دنیا بھر میں کوئی شجاع میرے جیسا نہیں"۔ اسی طرح کسی کی جنگ جوئی کی نقل اتار کر اسے بہادر ثابت کرنا، چاہے اس نے عمر بھر کوئی جنگ نہ کی ہو۔ اسی طرح کسی غاصب ظالم کے متعلق کہنا کہ اس نے گلا دبا کر میرا لقمہ حلق سے نکال لیا۔ یہ انداز بیان تصویر کشی کہلاتا ہے اور کنایہ ہوتا ہے۔

تعریض کسی خاص شخص کو تنبیہ کرنے کے لیے یا اس کا حال بیان کرنے کے لیے عام انداز بیان اختیار کرنا تعریض کہلاتا ہے۔ مثلاً حضورؐ کا یہ قاعدہ تھا کہ بعض لوگوں کو تنبیہ کرنے کے لیے یوں فرمایا کرتے تھے: "لوگ ایسا کیوں کرتے یا ایسا کیوں کہتے ہیں"، سو جسے جتانا منظور ہوتا وہ سمجھ جاتا تھا۔ قرآن مجید کی یہ آیت بھی اسی قبیل سے ہے: ما کان لمؤمن ولا مؤمنة اذا قضی الله ورسوله امرا الایه۔ آیت کا انداز بیان عام ہے مگر اشارہ حضرت زینبؓ کے بھائیوں کی طرف ہے جو حضور کے حکم پر زینبؓ کا نکاح زیدؓ سے کرنے میں

میں ہچکچا رہے تھے۔ اسی طرح اس آیت میں حضرت ابوبکر صدیق کی طرف اشارہ ہے:

ولا یاتل اولوا الفضل منکم والسعۃ الخ مسطح بن اثاثہؓ ایک غریب مہاجر تھے اور حضرت ابوبکر صدیقؓ ان کا خرچ دیا کرتے تھے۔ جب واقعۂ افک میں غلطی سے یہ صاحب بھی شامل ہو گئے تو ابوبکر صدیقؓ کو سخت صدمہ ہوا اور انہوں نے قسم کھالی کہ آئندہ ایسے شخص سے کوئی مالی سلوک نہ کروں گا۔ اس پہ اللہ تعالیٰ نے بطورِ تعریض حضرت ابوبکر صدیقؓ سے گویا مسطح کی سفارش فرمائی۔

مجازِ عقلی فعل کے اصلی فاعل اور کسی اور شخص میں کسی مشابہت کے باعث فعل کی نسبت اصلی فاعل کی بجائے دوسرے کی طرف کرنا۔ اسی طرح مفعول بہ کا بھی حال ہے کہ اس کے بجائے کسی مشابہت کے باعث دوسرے شخص کو مفعول بہ قرار دینا۔ مثلاً: "امیر نے محل بنایا"، حالانکہ بنایا تو معماروں نے تھا لیکن بنوانے والا چونکہ امیر تھا لہٰذا فعل اس کی طرف منسوب ہوا۔ اسی طرح "بہار نے سبزہ اگایا"۔ "دریا چلا"، حالانکہ سبزہ اگانے والا تو اللہ تعالیٰ ہے۔ ہاں! موسمِ بہار میں سبزہ اُگا تو اس کی طرف منسوب ہوا۔ اسی طرح دریا نہیں بلکہ اس میں پانی چلا تھا۔ یا مثلاً "پرنالہ بہ نکلا"، حالانکہ اصل میں پانی بہا تھا نہ کہ پرنالہ۔

قرآن کے اسلوبِ بدیع

ترتیب و تدوینِ قرآن قرآن مجید ہر لحاظ سے اور ہر حیثیت سے ایک منفرد کتاب ہے۔ اس میں عام کتابوں جیسا تصنیفی ربط و تبویب اور تفصیل و ترتیب نہیں ہے۔ یوں سمجھئے کہ یہ ایک مجموعۂ مکتوبات ہے جسے خالقِ کائنات نے اپنی سلطنت کے افراد کو وقتاً فوقتاً بھیجا ہے۔ جمع ہو جانے پہ ایک مجموعۂ فرامین مرتب ہو گیا ہے۔ حضورؐ نے ان فرامین کو یاد رکھا اور لکھوا دیا۔ صحابہؓ نے بھی انہیں یاد کر لیا اور مختلف مجموعوں کی صورت میں محفوظ کر لیا۔ حضورؐ اسے نمازوں، خطبوں اور درس و وعظ میں پڑھتے اور سمجھاتے۔ اس کی ترتیب و تدوین وہی ہے جس پہ حضورؐ نے اسے پڑھا اور پڑھایا تھا۔ آخری رمضان میں اسے تراویح میں بھی پڑھا گیا اور جبریلؑ سے دو مرتبہ اس کا دور ہوا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانۂ خلافت میں بمشورۂ عمر فاروقؓ اسے ایک جلد میں موجودہ ترتیب کے ساتھ جمع کیا اور اس کا نام مصحف رکھا گیا۔

صحابہؓ کے ہاں سُور قرآن کی پانچ قسمیں تھیں :

۱۔ طوال : لمبی لمبی سورتیں جیسے البقرہ، آل عمران، النساء وغیرہا۔
۲۔ مئین : وہ سورتیں جن کی آیات یک صد یا اس سے کچھ اوپر ہیں۔
۳۔ مثانی : سو سے کم آیات والی سورتیں۔
۴۔ طوالِ مفصل : چھوٹی سورتوں میں سے نسبتاً طویل
۵۔ قصارِ مفصل : سب سے چھوٹی سورتیں۔

یہ سورتیں الفاتحہ کے بعد (جس کی حیثیت مقدمۂ قرآن کی سی ہے) مندرجہ بالا ترتیب سے ہی جمع ہوئی ہیں، ہاں! بعض جگہ کسی مصلحت سے اس کے خلاف بھی ہوا ہے، مثلاً مثانی کی بعض سورتیں مئین میں داخل کر دی گئی ہیں کیونکہ بلحاظ مضمون وہ ان سے مربوط ہیں۔

اسلوب بیان

جیسا کہ ابھی گزرا، قرآنی سورتوں کی حیثیت شاہی فرامین و مکاتیب کی سی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اوائل و اواخر میں فرمان و مکتوب کی رعایت رکھی گئی ہے۔ بعض سورتیں حمدِ خداوندی سے بعض مُرسِل یا مُرسَل الیہ کے نام و صفات سے، بعض بلا عنوان شروع کی جاتی ہیں۔ کچھ سورتوں کو بیانِ مطلب سے شروع کیا گیا ہے۔ بعض فرمان لمبے ہیں اور بعض چھوٹے۔ بعض سورتوں کا آغاز تسبیح سے ہوتا ہے۔ بعض کی ابتداء میں کتاب کی شان بیان کر کے فوراً مطلب کی بات شروع کر دی گئی ہے، مثلاً :

ذلك الكتاب لاريب فيه هدى للمتقين۔ (البقرہ)

سورة انزلنها وفرضنها (النور)

یہ اندازِ ابتداء معاہدوں جیسا ہے، جن میں ابتداء سے ہی معاہدہ کرنے والوں اور مفہومِ معاہدہ کا ذکر ہوتا ہے۔ صلح حدیبیہ کا معاہدہ اس طرح شروع ہوتا ہے :
هذا ما قاضى عليه محمد صلى الله عليه وسلم۔

تنزيل الكتاب من الله العزيز الحكيم (۱:۳۹) یہ سورت بھیجنے والے خدا کی صفات سے شروع ہوئی ہے۔

كتب احكمت اياته ثم فصلت من لدن حكيم خبير۔ (۱:۱۱) یہ سورت فرمانِ شاہی کی عظمتِ شان اور بھیجنے والے کی صفات کے ذکر سے شروع ہوئی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسا کہ حکومت کے شاہانہ احکام صادر ہوتے ہیں کہ :

"بارگاہِ خلافت سے حکم دیا جاتا ہے:" فلاں ملک، شہر یا علاقے کے لوگوں کو حکومت کی طرف سے حکم دیا جاتا ہے" یا جیسا کہ حضورؐ کے مکتوبات تھے: من محمد رسول اللہ الی ھرقل عظیم الروم۔

بلاعنوان شروع ہونے والی سورتیں بھی بعض خاص مکاتیب کی طرح یوں شروع ہوتی ہیں:

اذا جاءك المنافقون ..... قد سمع اللہ قول التی تجادلك ....

..... یایھا النبی لم تحرم الخ

بعض سورتوں کی ابتداء قصائدِ عرب کی تشبیب وتمہید کی مانند ہوتی ہے۔

والصافات صفاً ٥ فالزاجرات زجراً الخ

والذاریات ذرواً ٥ فالحاملات وقراً الخ

اذا الشمس کورت ٥ واذا النجوم انکدرت الخ

سورتوں کا اختتام بھی فرامین ومکاتیب کی مانند نصائح اور جوامع الکلم پر ہوتا ہے جن میں ترغیب وترھیب اور تاکید وتوثیق عمل کا بیان ہوتا ہے۔ یہ اواخر گویا سارے فرمان کا خلاصہ ہوتے ہیں جنہیں بطور تاکید آخر میں رکھ دیا گیا ہے۔

بعض سورتوں کے درمیان میں بڑے مؤثر اور فصیح وبلیغ انداز میں حمد وتسبیح یا انعام واحسانِ الٰہی کا مضمون آ جاتا ہے: قل الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفٰی ٥ آ اللہ خیرا اما یشرکون ٥ اس کے بعد ردِ شرک واثباتِ توحید کا بیان ہے۔

بعض دفعہ سورت کی ابتداء وانتہاء ایک جیسی ہوتی ہے۔ جیسا کہ البقرہ میں مخاصمہ یہود کی ابتداء وانتہاء یوں ہوئی ہے: یٰبنی اسرائیل اذکروا نعمتی التی انعمت علیکم۔

بعض دفعہ مخاصمۂ اغیار کے سلسلے میں موضوعِ بحث کو متعین کرنے کے لیے کوئی مؤثر انداز اختیار کرتے ہیں، مثلاً آل عمران میں مناظرۂ اہل کتاب کو ان الدین عند اللہ الاسلام سے شروع کیا گیا ہے۔

ترکیبِ آیاتِ قرآنی کا اُسلوب

لوگ نثر کی نسبت نظم وشعر سے زیادہ مانوس ومتاثر ہوتے ہیں

کلامِ الٰہی کو شعر ونظم نہیں کہا جا سکتا مگر وہ نثر بھی نہیں ہے۔ یوں سمجھیے کہ وہ اپنی

نظیر آپ ہی ہے ۔ انسانی کلام میں اس کی نظیر تلاش کرنا بے سود ہے ۔ مگر دین چونکہ انسانوں کی ہدایت کے لیے اترا ہے لہذا انسانی کلام کے خصائص اور لوگوں کے محاورات کو مدنظر ضرور رکھتا ہے ۔ مثلاً اہل عرب کے قصائد اشعار و ابیات سے مرکب ہوتے تھے تو قرآنی سورتیں آیات سے مرکب ہیں ۔ ابیات میں وزن و قافیے کی پابندی کی جاتی تھی، قرآنی آیات چونکہ شعر نہیں لہذا وہ ان پابندیوں سے یکسر آزاد ہیں، تاہم ان میں فاصلے، قافیے، زیر و بم، موسیقی، تاثیر اور اجمالی وزن و ردیف کو مدنظر رکھا ہے ۔ آیات سے ابیات کو کوئی نسبت اگر ہے تو فقط اتنی کہ دونوں خوش الحانی سے پڑھنے، تاثیر پیدا کرنے، جذبات کو ابھارنے اور لوگوں کو سنانے کے لیے ہوتی ہیں ۔ ورنہ فنی و اصطلاحی اوزان اور قافیے عروض کی پابندی کو آیات پر ہرگز منطبق نہیں کیا جاسکتا ۔

ابیات و اشعار سے اثر پذیری کے اسباب یہ ہیں :

ا ۔ کلام کے اجزاء میں باہمی موافقت و مناسبت ۔
ب ۔ بندش الفاظ و فقرات کی چستی ۔
ج ۔ وزن اور ردیف و قافیے کی یکسانی ۔
د ۔ کلام کا اجمال و اختصار ۔
ھ زوردار الفاظ اور مؤثر تراکیب ۔

یہی وہ اسباب ہیں جو عرب و عجم کے مذاق سلیم اور فطرت کے مطابق ہیں ۔ فنی و اصطلاحی باریکیوں کو اگر نظر انداز کر دیں تو یہ چیزیں تمام اقوام و ملل میں مشترک ہیں ۔ اختلاف صرف اپنے ماحول اور زبان و بیان کے اسلوب میں ہے، یہی سبب ہے کہ عربی و عجمی شاعری کے سارے قواعد ایک دوسرے پر منطبق نہیں ہوتے، گو اصولاً متحد ہیں ۔ مندرجہ بالا اسباب مل کر اجزاء کلام میں ہم آہنگی، لذت، اثر اور زور پیدا کرتے ہیں ۔ ہر ملک و قوم کے نظم کا ذخیرہ، گیت، غزلیں، دوہے وغیرہ اس پر شاہد ہیں ۔ دلکش آواز اور دلفریب نغمہ کلام میں تاثیر اور زور پیدا کرتا ہے ۔ کلام میں ایک تخمینی موافقت ہی اسے خاص و عام میں مقبول و مؤثر بناتی ہے ۔ دیہاتی جاہل عوام بھی اس حقیقت سے باخبر ہیں، چاہے وہ فن عروض کا نام بھی نہیں جانتے ۔

پس اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت کے اس خاصے کی رعایت فرمائی اور آیات میں یہی تخمینی موافقت رکھ دی تاکہ انہیں پڑھنے سننے سے لذت و سرور بھی حاصل ہو ۔

فلسفیانہ بحث و احکام پر مشتمل نہیں ہے

یہ کلام محض ایک فلسفیانہ ابحاث و احکام پر مشتمل نہیں ہے۔ اس میں انسانی فطرت کو پوری طرح مدنظر رکھا گیا ہے اور تاثیر کا مادہ بدرجۂ اتم اس میں رکھا گیا ہے تاکہ تلاوت و قراءت سے بھی لوگوں کو کھینچ سکے۔ آیاتِ قرآنی میں بھی اجمالی وزن و موافقت ملحوظ ہے جو تمام اقوام میں مشترک ہے۔ جو قواعد و ضوابط تغیر پذیر اور مختلف ہیں انہیں نظر انداز کر دیا ہے۔ حسنِ اجمالی اور موافقتِ اجزاء کا عنصر اصطلاحی قواعد سے پیدا بھی نہیں ہو سکتا۔ قرآن اس لحاظ سے بھی معجزہ ہے کہ نہ نظم ہے نہ نثر۔ لوگوں کی اصطلاحات سے آزاد ہے مگر بے پناہ تاثیر و حسن کا مالک ہے۔ فاصلوں کی رعایت آیات کے اواخر میں اوزان کی موافقت، اصطلاحی نظم نہ ہونے کے باوجود شعر سے زیادہ زوردار اور مؤثر ہونا قرآن کے خواص ہیں۔ آیات کو ایسا رکھا گیا ہے کہ پڑھنے والے کی آواز، سانس کا ٹوٹنا، دو سانسوں کا درمیانی فاصلہ ایک مناسب حد تک موافق اور متناسب رہے۔

سانس کے پھیلاؤ کے لحاظ سے سورتوں کے اوزان تین اقسام پر مشتمل ہیں: طویل متوسط اور قصیر۔ طویل کی مثال سورۂ نساء ہے، متوسط کی مثال سورۂ اعراف و انعام اور قصیر کی مثال سورۂ شعراء اور دخان ہے۔ سورتوں کے اختتام میں حرفِ مدہ کی کھینچ تان، لمبائی اور تکرار کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ آخری حروف کہیں الف، واؤ، یا، (حروف علت) ہیں اور کہیں ج اور ق وغیرہ۔ مثلاً یعلمون تعلمون، مومنین، مستقیم کا توافق۔ خروج، مریج، تحدید، فواق اور عجاب وغیرہ کا وزن و قافیہ اجمالاً ایک سا ہے۔ کریما، بصیرا رحیما، حدیثا وغیرہ اور زکریا، خفیا، سقیا، ولیا، رفیعا، یحیی، سمیا وغیرہ ہم وزن و ہم قافیہ ہیں۔ سورۂ محمد کی آیات کے آخر میں حرفِ میم اور الرحمن میں حرفِ ن کا تکرار لطف دیتا ہے۔ بعض سورتوں میں ایک مخصوص جملہ بار بار آتا ہے مثلاً شعراء قمر، الرحمن اور المرسلات میں۔ بعض دفعہ تلاوت کرنے والوں کی تفریح کی خاطر وزن بدل دیتے ہیں اور تخفیفی تو انی مختلف ہو جاتے ہیں، مثلاً اِدًّا، ہدًّا، سلامًا اور کرامًا، طین، ساجدین اور منتظرین۔ حالانکہ ان سورتوں کی ابتدائی آیات کے اوزان ان سے بالکل مختلف ہیں۔

عموماً صفاتِ الٰہیہ، افعال اور جمع مذکر کی صفات کو اواخرِ آیات بنا کر ہدایت و تنبیہ اور تاثیر کا مضمون نکالا جاتا ہے: الحکیم الخبیر، علیما حکیما، تتقون، تتفکرون، لاولی الالباب، خبیرا وغیرہ۔ بعض دفعہ الفاظ کو بدل کر لمبا کرتے ہیں مثلاً الیاس سے

بجائے الیاسین، سیناد کے بجائے سینین۔ بعض دفعہ جملوں کی ترتیب قصیر سے طویل کی طرف ترقی کرتی ہے اور اس سے کلام میں زور پیدا ہوتا ہے مثلاً خذوہ فغلوہ ثم الجحیم صلوہ، ثم فی سلسلۃ ذرعھا سبعون ذراعا فاسلکوہ، بعض دفعہ پہلی دو آیات کو ملائیں تو تیسری آیت کے برابر ہو جاتی ہیں۔ بعض دفعہ ایک ہی آیت کے تین اجزا ہوتے ہیں جو مل کر ایک کلام اور متناسب عبارت بنتے ہیں:

یوم تبیض وجوہ و تسود وجوہ (دوجز) فاما الذین الخ (تیسرا جز) بعض دفعہ چھوٹی آیات میں کوئی لمبی آیت رکھ دیتے ہیں تاکہ بے ساختگی، سادگی، فطرتی، حسن و تاثیر اور ترغیب و ترھیب میں انسانی کلام کے مقابلہ میں قرآن کا اعجاز ثابت ہو۔

بعض سورتوں کا انداز بیان خطیبانہ اور بعض کا حکیمانہ بھی ہے۔ ان میں دیگر سورتوں سے الگ تعلق کچھ خصائص پائے جاتے ہیں۔ بعض کا انداز باہمی انسانی گفتگو کی طرح کا ہے۔ بعض میں مراسلات و مکتوبات جیسا انداز اختیار کیا گیا ہے۔

قرآن کے متعلق سوالات و جوابات

سوال: قرآن میں علوم خمسہ کے تکرار کا سبب کیا ہے؟

جواب: ان علوم کی اہمیت، لوگوں کو ان کے رنگ میں رنگ دینے اور ان کے ذہن نشین کرا دینے کی خاطر تکرار کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ جب کوئی بے علم پہلی مرتبہ ان مضامین کو پڑھے گا تو ان سے تعلیم کا فائدہ حاصل ہو گا۔ عالم کو تکرار کے باعث مزید بصیرت و مہارت اور حکمت و علم حاصل ہو گا۔ آیاتِ احکام میں تکرار کم ہے کیونکہ ان سے غرض فقط شاہی فرامین کی تلقین و تبلیغ ہے۔ دوسری چار قسم کی آیات (علم مخاصمہ تذکیر بآلاء اللہ، تذکیر بایام اللہ اور تذکیر بالموت و مابعد الموت) کی تکرار بہت زیادہ ہے تاکہ انہیں بار بار پڑھ کر ذہن نشین کیا جائے اور دل کو عمل پہ آمادہ کیا جائے۔ تکرار میں طرز بیان اور اسلوب ادا کا اختلاف ملحوظ رکھا گیا ہے تاکہ مطلوبہ فوائد حاصل ہو سکیں اور اکتاہٹ پیدا نہ ہو۔

سوال: علوم خمسہ کو منتشر طور پہ پھیلا کر کیوں بیان کیا گیا ہے۔ ترتیب وار ہر مضمون کو ایک ہی جگہ کیوں نہیں رکھا گیا؟

جواب: اس اسلوب میں عام انسانی فطرت بالخصوص ان پڑھ عرب عوام کی مخصوص حالت و فطرت کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ وہ قرآن کے پہلے مخاطب تھے، علوم و فنون

اور کتابت وقرأت سے نا آشنا تھے۔ لہٰذا قرآن کو ان کے اسلوب میں اتارا گیا تاکہ وہ اس سے کماحقہ فائدہ ہدایت حاصل کر سکیں۔ مضامین کو ترتیب وتدوین سے پیش کیا جاتا تو وہ حیران ہو جاتے اور قرآن سے ہدایت یاب نہ ہو سکتے۔ مضامین کی تکرار وانتشار سے تاکید وتوثیق اور مخاطب کے ذہن نشین کرنا بھی مقصود ہے ضرورت اور موقع ومحل کے مناسب وقتاً فوقتاً نازل ہونے والے کلام میں پھیلاؤ کا ہونا لازم تھا۔

سوال: قرآن میں شعراء کی مانند وزن اور ردیف قافیے کی رعایت کیوں نہیں رکھی گئی؟

جواب: اس صورت میں قرآن سے ہدایت کا مقصد حاصل نہ ہو سکتا۔ لوگ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعروں میں سے ایک اچھا شاعر ضرور مان لیتے لیکن نبی ورسول نہ مانتے۔ قرآن ایک معجز کلام ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے اُمی پیغمبرؐ کی زبان سے لوگوں کے سامنے پیش کر کے وزن اور اسلوب کلام کا ایک نیا اور اچھوتا انداز نکالا جو ہر لحاظ سے بے نظیر ہے۔ نبی اُمیؐ کی زبان سے اس کا ادا کرایا جانا خود ایک معجزہ ہے جو کسی اور صورت میں ظاہر نہ ہو سکتا تھا۔ قرآن کا یہ انداز اس سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہو گیا اور رہتی دنیا تک معجزہ ثابت ہو گیا ہے۔

سوال: قرآن مجید کی وجوہ اعجاز کیا ہیں؟

جواب: ان وجوہِ اعجاز کو کئی اقسام میں بیان کیا جا سکتا ہے:

ا۔ ایک بالکل جدید اور اچھوتا اسلوب بیان جو فصیح وبلیغ عربوں کے قصائد، خطبات رسائل، اور محاورات سے بالکل جداگانہ اور سب پر فائق ہے۔ اس اسلوب میں ان سب کے مقاصد ونتائج کو تو مدنظر رکھا گیا ہے مگر پابندی کسی کی بھی پابندی کی گئی۔

ب۔ پہلی امتوں کے تاریخی واقعات اور قصص واحکام کا بیان۔ حالانکہ پیش کرنے والا خود اُمی ہے۔

ج۔ آنے والے واقعات واحوال کی سچی پیش گوئیاں جو حرف بحرف درست ثابت ہوئیں۔

د۔ قرآن کا اعلیٰ درجے کا بلیغ طرز بیان خود معجزہ ہے۔ اس میں موزوں کلمات، حسین ترکیب، چست بندشیں نہایت بے ساختگی اور سادگی سے بیان کی گئی

ہیں۔ فقرات کی ترتیب و ترکیب، زور بیان، اثر اندازی، سادگی، بے تکلفی، آمد اور روانی بے مثال ہے۔

ھ۔ ایک ہی مضمون کو کئی سورتوں میں الگ الگ طرز ادا سے کہیں مختصر اور کہیں مفصل بیان کیا گیا ہے، لیکن قاری کو ہر جگہ لطف آتا ہے، اکتاہٹ اور ملال پیدا نہیں ہوتا۔ انبیاء کے قصے جو اعراف، ہود، شعراء، صافات اور ذاریات میں آئے ہیں وہ اس پر شاہد عدل ہیں۔

و۔ تشبیہ، استعارہ، کنایہ اور مجاز عقلی کا حسین و متوازن استعمال جو فصاحت و بلاغت کی انتہاء کے باوجود سادہ اور بے ساختہ ہے۔ عوام و خواص، علماء و جاہل ان سے یکساں مستفید ہوتے ہیں۔

ز۔ قرآن کے مضامین ہدایت، اس کے اعلیٰ مقاصد اور اس میں بیان کردہ عقاید و اعمال اپنے معانی و مطالب میں خود معجزہ ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن کا مصنف صرف خالق کائنات ہی ہے جو فطرتِ انسانی اور کائنات کی گہرائیوں سے پوری طرح آگاہ ہے۔ علومِ خمسہ جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں وہ اس کے کلام الٰہی ہونے کی دلیل ہیں۔

فنِ تفسیر اور اس کے متعلقات

مفسرین کی اقسام تفسیر قرآن میں مختلف جماعتوں کا رجحان و عمل مختلف ہوتا ہے۔

۱۔ محدثین، جو تفسیر کے متعلق ہر قسم کی مسند، مرفوع، متصل، منقطع، مرسل، ضعیف اسرائیلی روایات اور موقوف اقوال و آثار جمع کر دیتے ہیں۔

۲۔ متکلمین، جو تفسیر میں عقائد و کلام کے پیش نظر گفتگو کرتے ہیں۔ مخالفین کے اعتراضات و شبہات کا جواب دیتے اور اہل حق کے مسلک کی وضاحت کرتے ہیں

۳۔ فقہاء اور اہل اصول، جو احکام و قوانین اور استنباط و اجتہاد کے پیش نظر تفسیر میں کلام کرتے ہیں۔

۴۔ اہل صرف و نحو، جو قواعد عربیت کے پیش نظر قرآنی آیات میں کلام کرتے ہیں۔

۵۔ اہل معانی، جو علم معانی و بیان کے نقطہ نظر سے قرآن کی ادبی و بیانی